رجسٹرڈ نمبر ل ۲۸۵ جلد ۱۱ شمارہ ۱

نگار

بھوپال سے ہر ماہ کی پندرہ کو شائع ہوتا ہے چندہ سالانہ ہندوستان میں پانچ روپیہ ہندوستان سے باہر سات روپیہ

فہرست مضامین جنوری ۱۹۲۷ء

تصاویر:- ماہ نو اور بلبل اسیر

ملاحظات ---------- ۲
شمالی ہند اور دکن — مسٹر سعیدی۔ بی۔ اے — ۵
آغاز ہستی (ڈراما) — مجنوں گورکھپوری — ۱۷
اورنگ آباد اور اسکا نواح — جناب تمکین الکاظمی — ۲۹
حالی اور نثر اردو — مسٹر سید محی الدین قادری زور بی اے — ۳۷
لیلیٰ مجنوں (نظم فارسی) — مولٰنا فاروق چریا کوٹی مرحوم — ۵۲
غزل — حضرت درد کاکوروی — ۵۵
خواب (افسانہ) — علی اکبر کاظمی بی۔ اے کیمبرج — ۵۶
ظہیر الدین محمد بابر — جناب سید عبد السبحان ناظر — ۶۰
ہمشیر مرحومہ (نظم) — حضرت اصغر لودہیانوی — ۶۷
شہید جستجو (نظم) — امین حزیں — ۶۸
اہل دہلی اور اہل لکھنو — جناب عالی رفاعی — ۶۹
میر قافلہ کی صدا (نظم) — سید محمود اسرائیلی — ۷۷
غزلیات — اکبر حیدری، دل شاہجہانپوری، زدمی، کوثر، یوسف۔ ہادی۔ کیف۔
آسمانی سوار (فسانہ) — سید حامد حسن قادری — ۸۱
استفسارات ---------- ۸۵
کتب موصولہ و معلومات ---------- ۹۰-۹۴-۹۶

بسم اللہ

نگار

ایڈیٹر نیاز فتحپوری

شمارہ (۱) | جنوری ۱۹۲۷ء | جلد (۱۱)

ملاحظات

نگار کا پانچواں سال بھی عافیت سے گزر گیا اور اگر محض بقا بجائے خود کوئی امر باعث مسرت ہو سکتا ہے تو مجھے اعتراف کرنا چاہیے اُن حضرات کے لطف و کرم کا، جن کی اعانت کو اگر میں چاہوں تو شاعرانہ لب و لہجہ میں "مسیحا نفسی" سے تعبیر کر سکتا ہوں۔ اس سلسلہ میں مجھے سب سے پہلے اعلیٰحضرت حضور پر نور فرمانروائے دارالسرور رامپور کے بارگاہ ہمایوں میں اپنا عاجزانہ تشکر پیش کرنا چاہیے کہ حضور ممدوح کی نکتہ رس و علم دوست فطرت نے نگار کی خدمات کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھ کر اس کو حاضری کا شرف بخشا اور شاہانہ امداد فرمائی ؎

اے جودِ تو دست و دل سخا را
وے عزم تو بال و پر صبا را

ہندوستان کے موجودہ مسلمان فرمانرواؤں میں حضور ممدوح اپنی مشرقی خصوصیات کے لحاظ سے ایک خاص امتیاز کے مالک ہیں اور جن کو کبھی حاضری کا موقع ملا ہے وہ واقف ہیں کہ ذاتِ اقدس کس درجہ عزت و احترام کی مستحق ہے۔ جس وقت تک مجھے شرف باریابی حاصل نہ ہوا تھا، میں اعلیٰحضرت کی خصوصیات کا صحیح اندازہ نہ کر سکتا تھا، لیکن جب خوش بختی سے یہ زرین فرصت عطا ہوئی اور عزت ہمکلامی میسر آئی تو سب سے پہلے حقیقی معنے میں مجھے اسی وقت علم ہوا کہ ذات گرامی کن غیر معمولی انسانی صفات سے متصف ہے۔ اعلیٰحضرت کا تبحر علمی، قوت حافظہ، جامعیت فنون، صحت فکر، اصابت رائے اور حسن تدبیر ایک ہی وقت میں ان سب کا نہایت گہرا اثر مجھ پر پڑا اور میں حیران ہو گیا کہ ایک ہستی کے اندر یہ تمام خصوصیات کیونکر یکجا ہو گئیں۔ سچ ہے ؎

لیس عند اللہ بمستنکر
ان یجمع العالم فی شخص واحد

اس کے بعد مجھے عالی جناب نوابزادہ **کپتان محمد سعید الظفر خاں بہادر** اور اُن کے برادر اصغر نوابزادہ **کپتان محمد رشید الظفر خاں بہادر** کا شکریہ ادا کرنا چاہئیے جنکی ہمدردیاں حاصل کرنے کا فخر نگار کو شروع ہی سے حاصل ہے اور جن کی امداد سے وہ ہمیشہ گرانبار رہیگا۔

بھوپال کی ان دو رفیع القدر ہستیوں کا علم اہل بھوپال کو خواہ کسی طرح ہے ہو لیکن مجھ انکی جن خصوصیات نے کشاں کشاں اُن کے آستانہ تک پہنچا دیا، وہ تھی اُن کی بلندی فطرت اور صحت ذوق ہے۔ انسان کے لئے صرف نوجوان ہونا ہی ایک ایسا مُسکت عذر آزادی ہے کہ عقل سلیم کو بھی اسکے سامنے سپر ڈالدینا پڑتی ہے۔ چہ جائیکہ اس کے ساتھ دولت و ثروت جاہ و امارت بھی شامل ہو جائے۔ قیامت ہے لیکن دنیا کو باور کرنا چاہئیے اگر میں کہوں (کیونکہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ "برسم مدحت اندیشاں نمی گویم") کہ میں نے اس عمر کے امراء میں یہ صلاحیت نفس، یہ پاکیزگی اخلاق، یہ متانت و سنجیدگی دیکھی نہ سنی۔ کثر اللہ امثالہما۔

اسی سلسلہ میں مجھے ان تمام احباب کرام و ناظرین نگار کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہئیے جنھوں نے توسیع اشاعت میں حصہ لیا اور نگار کو حاضری کی اجازت دی۔

اس وقت جبکہ میں اپنے جذبات منت پذیری کی داد دے رہا ہوں، غالباً یہ امر حیرت انگیز نظر آئیگا کہ میں نے اس سلسلہ میں اُس ہستی کا ذکر نہیں کیا جس کے خسروانہ الطاف کی میری ہر ہر جنبشِ قلم ممنون ہے اور جس کا نام نگار کے ہر ہر لمحۂ حیات پر مُہر دوام کی طرح ثبت ہے، لیکن میں نے قصداً یہ جرأت نہیں کی، کیونکہ **اعلیٰحضرت قدر قدرت، گردوں رکاب نواب مستطاب حاجی محمد حمید اللہ خاں بہادر بالقابہ فرمانروائے دار الاقبال بھوپال** کی بارگاہ سے جو نسبت مجھے حاصل ہے اُس کا اقتضا اس سے بہت زیادہ بلند ہے کہ میں صرف شکر کو اظہار جذبات کا کافی ذریعہ خیال کروں یہ تو حقیقتاً اس کیفیت سے متعلق ہے جس کو بقول عرفی

وز نشانِ آستانت سجدہ در قصد و رجاہ

کہتے ہیں اور جذبات منت پذیری کی اس دُنیا سے وابستہ ہے جہاں صرف خاموشی کو "حدتمار" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ شخص جس کی ایک سانس سانس مسلسل گیارہ سال سے اعلیٰحضرت فرمانروائے بھوپال کے جود و سخا، بذل و عطا کی گرانبار منت ہو، جس کے رشتہ رشتہ میں اس آستانہ کا نمک خون بن کر دوڑ رہا ہو وہ کیا خاک مدح سرائی کر سکتا ہے اور کہاں سے اُس کو ایسے الفاظ میسر آسکتے ہیں جن سے وہ اپنی قلبی کیفیت کا اظہار کر سکے، اس لئے اگر میں نے اس "قبلۂ امن و امان، کعبۂ جان و ایمان" کے ذکر سے احتراز کیا تو اسکی وجہ یہ نہیں ہے کہ میں اپنے اس فرض سے آگاہ نہیں ہوں بلکہ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ع ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد۔ اور دوسرا یہ کہ میں اس فرض سے کسی طرح عہدہ برآ نہیں ہو سکتا ؎

در حضورت از دعا گویم چہ سود   گوئی از تزویر دستاں میزنم
ساکنم این نغمہ را در نیم شب   ہمرہ مرغ سحر خواں میزنم

جی چاہتا تھا کہ اس ماہ کے رسالہ میں اپنی گزشتہ پانچ سال کی خدمات کا احتساب کرتا اور ناظرین کرام سے پوچھتا کہ وہ اُنھیں کس نگاہ سے دیکھتے ہیں، کیونکہ اس باب میں خوب و زشت، حسن و قبح کا معیار میرے نزدیک صرف یہ ہے کہ ؎

گرم تو بندہ شمردی زخواجگی صد شکر   وگر قبول نہ کردی زناکسی فریاد

لیکن اس خیال سے کہ کہیں یہ بھی طبع نازک پر گراں نہ ہو، خاموشی اختیار کرتا ہوں اور بغیر اس خیال کے کہ ماضی کیا تھا مستقبل کی طرف قدم اٹھاتا ہوں خدا کرے میری یہ مساعی مشکور ہوں ؎

سخن طرازی و دانش ہنر نظیری نیست
قبول دوست مگر نالۂ حزیں گردد

اس مہینے کے مضامین میں جناب سعیدی بی۔ اے کا مضمون **شمالی ہند اور دکن** جو آئندہ مہینے میں ختم ہوگا فاضل مضمون نگار کی مورخانہ کاوش پر شاہد ہے۔ حضرت مجنوں کا **آغاز ہستی** برناڈ شا (جس کو اس سال ادبیات میں نوبل پرائز ملا ہے) کے ڈرامہ کا ترجمہ ہے۔ برناڈ شا کی شہرت و عظمت ہر شخص کو معلوم ہے لیکن جناب مجنوں نے بھی جس حسن کے ساتھ ترجمہ کیا ہے اس کی داد نہ دینا ظلم ہے۔ یہ بھی آئندہ مہینے میں ختم ہو جائیگا۔ تمکین کاظمی صاحب کا مضمون "**اورنگ آباد اور اس کے نواح**" پر مفید تاریخی معلومات رکھتا ہے۔ جناب زور بی۔ اے نے "**حالی اور نثر اردو**" کے عنوان سے نہایت پاکیزہ ناقدانہ مضمون لکھا ہے، کاش وہ اسی میں حالی کی شاعری کو بھی شامل کر لیتے۔

مضمون "**ظہیر الدین بابر**" مسٹر ہولڈن کی کتاب سلاطین مغلیہ سے ترجمہ کیا گیا ہے، ہولڈن کی یہ کتاب بہت مشہور ہے اور انگریزی زبان کی تاریخی کتابوں میں خاص امتیاز رکھتی ہے۔ مولوی سید عبد السبحان صاحب ناظر کا ملک کو ممنون ہونا چاہیے کہ انہوں نے اس کتاب کا ترجمہ کر لیا ہے۔ جو نگار میں شایع ہوتا رہیگا۔ مولوی صاحب موصوف نے جس خوبصورتی کے ساتھ ترجمہ کیا ہے اور ہولڈن نے جس قدر دلچسپ انداز میں یہ کتاب لکھی ہے اس کا اندازہ ناظرین خود کر سکتے ہیں۔

خواب، مسٹر علی اکبر کاظمی بی۔ اے کا طبعزاد فسانہ ہے اور خوب ہے "**آسمانی سوار**" دوسرا افسانہ ہے جسے مولوی سید حامد حسن قادری بچھرایونی نے انگریزی سے لیا ہے، جناب عالی رفاعی نے "**اہل دہلی اور اہل لکھنؤ**" کے عنوان سے بہت کارآمد اور حقیقت سے قریب مضمون تحریر کیا ہے۔ "**لیلیٰ مجنوں**" مولانا کیفی چریاکوٹی کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی ہے اور چونکہ مولانا فاروق چریاکوٹی رحمۃ سے مجھے بھی شرف تلمذ حاصل ہے۔ اس لئے میں تو اس کو واقعی تبرک سمجھتا ہوں۔ علامہ مرحوم کے علم و فضل کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔

نظموں میں جناب اصغر لودھیانوی کی نظم، مرثیہ گوئی میں ایک نئے مگر بلند معیار کی ابتدا ہے جو مجھے پسند ہے **شہید جستجو** میں ابن حزیں نے اپنے اس مقصد کو ظاہر کیا ہے جس کی تبلیغ وہ ہمیشہ کرتے رہتے ہیں اور کامیابی کے ساتھ۔ جناب اسرائیلی کی نظم **میر قافلہ کی صدا** بھی بہت پُر لطف ہے۔ غزلوں میں حضرت رزمی کے بعض بعض شعر بہت بلند ہیں خصوصیت کے ساتھ یہ شعر:-

نگاہ نے جسے چمکا دیا وہ دل میں رہا
جو داغ دل میں نہ ابھرا وہ آفتاب بنا

حسب وعدہ جناب چغتائی کی دونوں تصویریں اس رسالہ کے ساتھ شائع کی جاتی ہیں ان میں سے ایک کا عنوان **بلبل اسیر** ہے اور دوسری کا **ماہ نو** چغتائی کا صحیح خیال تو اسی وقت معلوم ہوتا، جب وہ خود ہی اس کی صراحت فرماتے لیکن جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں ماہ نو کی تصویر تو اس منظر کو ظاہر کر رہی ہے جب چاند دیکھ کر عورتیں حد درجہ کیفیت عبودیت کے ساتھ ہات اُٹھا کر دعا مانگتی ہیں، اور بلبل اسیر میں اس خیال کو ظاہر کیا ہے کہ باوصف اس کے کہ بلبل ایک ہات پر آزادانہ بیٹھی ہوئی ہے، لیکن وہ پھر قفس میں جانے کیلئے تیار ہے۔ جس کے پاس اُس کی حسین مالکہ نے ایک پھول لٹکا رکھا ہے۔ گویا اس تصویر سے اس تاثر کا اظہار مقصود ہے جس نے میر سے یہ شعر کہلوا لیا تھا:

در پہ بیٹھے ہیں ترے بے زنجیر
ہائے کس طرح کی پابندی ہے

نیاز

شمالی ہند اور دکن

شمالی ہند اور دکن کے تعلقات اور سترہویں صدی کی ابتدا میں دکن کی حالت

یہ امر مسلم ہے کہ "تنازع للبقا" اور خانگی افکارات ونزاعات سے جب انسان کو فرصت ملتی ہے اسی وقت وہ دلچپی کے ساتھ دوسرے مشاغل میں حصہ لیتا ہے، جب تک ان ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہوجاتا، اُس کی محنت وکوشش وقت اور توجہ اسی میں صرف ہوتی ہے "بقائے حیات" ایک ایسا اہم مسئلہ ہے جو انسان کی تمامتر توجہ اپنی طرف منعطف کرالیتا ہے، اپنی ہستی کو برقرار رکھنے اور اپنے متعلقین کو آرام وآسایش پہنچانے اور اُن کو خوش وخرم رکھنے کی ذمہ داری قدرتی طور پر انسان پر عاید ہوتی ہے اور اسی کا احساس اسے سعی ومحنت جانفشانی اور تگ ودو کے لئے آمادہ کرتا ہے، جب تک ضروریات زندگی سے فراغت حاصل نہ ہوجائے وہ دوسری طرف متوجہ نہیں ہوتا یعنی جب تک ایک گونہ اطمینان حاصل نہو جائے وہ انہماک کے ساتھ اسی کے حصول میں سعی بلیغ کرتا ہے اور یہی اس کا مطمح نظر اور یہی اس کا نصب العین ہوتا ہے، جب ان تفکرات سے چھٹکارا ملتا ہے تو پھر اس کی قوتیں ایک دوسری صورت اختیار کرتی ہیں اور جس کی جیسی دماغی ساخت اور ذہنی حالت ہوگی ویسے اُس کے نتائج ظاہر ہوں گے، کوئی تو عیش ونشاط میں مبتلا ہوجاتا ہے، کوئی لہو ولعب میں اپنی عمر گنوا دیتا ہے کوئی اختراع وایجاد میں اپنی تمام عمر صرف کردیتا ہے، کوئی کشورکشائی اور کشورستانی کو اپنا مقصد قرار دیتا ہے، مسلمان فاتحین کی حالت بھی ابتدا میں یہی تھی، خود اپنے وجود کو قائم رکھنے اور بیرونی سے محفوظ رہنے اور امور مملکت کے انصرام میں سرفروشانہ کوشش کی جبتک مرکزی حکومت مستقل طور پر منضم حالت میں نہ آگئی اور بیرونی حملوں کا خوف دور اور اندرونی فسادات اور بغاوتیں فرو نہ ہوگئیں انھوں نے دور دراز ممالک کو فتح کرکے سلطنت کو وسیع کرنے کی کوشش نہ کی؛

جغرافی حیثیت سے ہندوستان دو حصوں پر منقسم رہا، ایک تو شمالی ہند دوسرا جنوبی ہند۔ ہندوستان یعنی شمالی ہند کے مقابلہ میں دکن کا اطلاق زمانہ قدیم سے ہند کے جنوبی حصہ پر ہوا کیا ہے، شمالی ہند زیادہ تر میدانوں پر مشتمل ہے اور جنوبی ہند ایک سطح مرتفع ہے یا یوں کہئیے کہ ایک پہاڑی مثلث ہے جس کی دونوں جانب وسیع سمندر لہریں مار رہا ہے؛

شمالی ہند سے سطح مرتفع دکن بالکل علیحدہ رہا ہے لیکن نہ اس قدر کہ وندھیا اور ساتپورا پہاڑوں کا سلسلہ ہموار سطح دریائے ہند وگنگا سے بالکل خارج ہوجائے اس طرح مرتفع دکن کے درمیانی حصہ کی زبان، نسل، اور اخلاق وعادات شمالی آریوں اور جنوبی ڈراویڈیوں کی ایک مخلوط شکل ظاہر کرتے ہیں، اگرچہ محل وقوع کے اختلافات بہت ہیں تاہم وہ ہمالیہ سے سمندر تک کے کل ممالک کے جغرافی اتحاد میں رکاوٹ نہیں پیدا کرتے اور نہ یہ مذہب اور تہذیب کے ارتقا کے مانع ہیں، جو تمام ممالک کے لئے مشترک ہے، یہ امر واقعہ ہے کہ نسلی وتمدنی اختلاف کے باعث ہمیشہ یہ دونوں حصے جدا رہے، تاہم جنوب پر اقتدار قایم کرنے کے لئے شمال سے جو حملے ہوئے اُن میں ہمیشہ اجزاء ہم جنسی (اتحاد القومی) *Homogenetic elements* معاون اور اجزائے

ہرقسم کا عطر، تیل، خوردنی تمباکو اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ملتا ہے

غیر جنسی (مختلف النوع) Heterogentic elements اندر تھے۔[۱]

باوجود اس کے سیاسی اتحاد اس قدر مشکل تھا کہ بڑے سے بڑے حوصلہ مند حکمراں کو صرف اقتدار اعلیٰ ہر جو دور دراز ممالک میں حاصل ہوا اکتفا کرنا پڑا، جب کبھی شمالی ہند کے حکمرانوں کو فرصت ملی انھوں نے دکن کی طرف توجہ کی اور اس کو اپنی قلمرو میں داخل کیا، اور جب کبھی کمزور بادشاہ کے تخت نشین ہونے اندرونی بغاوتوں اور خانہ جنگیوں کے باعث مرکزی حکومت میں کمزوری پیدا ہوئی تو جنوبی ہند خود مختار ہوگیا، بہر حال ہمیشہ مرکز گیر قوتوں کا مقابلہ ہوتا رہا۔

چوتھی اور تیسری صدی قبل مسیح میں موریا خاندان کے راجہ حکومت کو استقلال حاصل ہونیکے بعد دکن پر حملہ آور ہوئے اور دکن کے راجاؤں کو اپنا فرمانبردار اور مطیع بنایا۔ جس سلطنت کی بنیاد چندر گپتا نے ڈالی تھی، اسوک کی وفات کے بعد اس میں انحطاط کے آثار نمایاں ہوئے ۱۸۵ ق۔م میں سپہ سالار پشپا مترا نے موریا خاندان کے آخری راجہ برہید راتھا کو قتل کرکے اس کا خاتمہ کردیا، اور خاندان سنگا کی بنیاد ڈالی[۲]

ساحل خلیج بنگال اور دریائے گوداوری اور کرشنا کے درمیان ہند کے حصے میں اندھرا قوم آباد تھی، جب بدھ مت کے جلیل القدر شہنشاہ نے دست اجل کو لبیک کہا تو اندھروں نے اس موقع کو غنیمت جان کر اس سے فائدہ اٹھایا، یہ خاندان اپنے پیشروں کی طرح قوی اور زبردست تھا۔ ابتک ہندوستان کے اعلیٰ حکمراں شمالی ہند کے راجہ ہوا کرتے تھے لیکن اس جنوبی حکومت نے ذی اقتدار ہونے کے بعد شمال کو اپنے تسلط میں لاکر اپنا اقتدار قایم کیا، اندھرا خاندان تین سو سال تک برسر حکومت رہا[۳]، لیکن ایک قلیل عرصہ کے لئے ایک غیر ملکی قبیلہ ساکیا نے ان کی حکومت میں رخنہ ڈالا، بالآخر زوال شروع ہوا، اور شمالی مفتوحہ ممالک زیادہ مدت تک اندھروں کے قبضہ میں نہ رہے، تیسری صدی عیسوی کی ابتدا میں اس خاندان کا بالکل خاتمہ ہوگیا[۴]۔ اندھرا خاندان کے آخری راجہ کے مرنے کے بعد راشٹرا کوٹہ نے اپنی حکومت قایم کرلی اور ان کا ایک خاندان تمام ملک دکن کا مالک بن گیا[۵]۔ چھٹی صدی عیسوی میں ان کی قوت کا خاتمہ چالوکیہ نے کیا[۶] چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی میں خاندان گپتا کے راجاؤں نے دوبارہ جنوبی ہند کے ایک حصہ پر قلیل عرصہ کے لئے حکمرانی کی، ساتویں صدی نے شمال کے زبردست راجہ ہرشا وردھن اور جنوب کے پال کشن کو جنگ و جدال پر آمادہ دیکھا، لیکن بالآخر دونوں مصالحت پر راضی ہوئے، اور دریائے نربدا کو حد فاصل قرار دیا۔

چالوکیہ کے نامور راجہ تاییپا Talipa نے راشٹرا کوٹا کو ۹۷۳ء میں حکومت سے بیدخل کیا، مگر بہت عرصہ تک چالوکیہ اطمینان کے ساتھ حکومت نہ کرسکے۔ اس لئے کہ مہاراشٹرا میں چولوں کی ایک نئی طاقت ترقی کررہی تھی، چالوکیہ اور چولا کے درمیان مسلسل جنگ کا آغاز ہوا، تاییپا دوم کے زمانہ میں

۱. History of yenhangir by Beni Parsh-d P. 254

۲. History of Maratha People by Kincaid & Parsenis P. 8.

۳. Earey Histomy of the Deccan by Bhandarkar P. 29

۴. According to Bhandarkar it is A.D. 218.

۵. Early History of the Deccan by Bhandarkar P. 36

۶. History of the Maratha People by Kincaid & Parsenis P.

کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے جو چیز خلاف خواہش پہنچے فوراً واپس کرکے اپنی پوری قیمت یا بدلے میں دوسری چیز منگا لیجئے۔ محصول آمد و رفت بذمہ کارخانہ

چالوکیہ کی قوت روبہ انحطاط تھی، سامیشورا چہارم (تاپلیپا دوم کے بیٹے) نے چالوکیہ قوت کو وسیع اور مستحکم کرنے میں بہت کوشش کی، ہشیار اور کار آزمودہ سپہ سالار بوما کی امداد و حسن تدبیر سے شمال پر حملہ آور ہوا اور اپنے آبا و اجداد کی مملکت کا جنوبی حصہ فتح کر لیا، لیکن سنہ ۱۱۵۶ء میں ایک نئے انقلاب نے اس کو حکومت سے دست بردار ہو کر سلطنت کی جنوب مغربی سرحد میں پناہ گزیں ہونے پر مجبور کیا۔ سلطنت چالوکیہ میں عام بد امنی پھیل گئی اور اس طوائف الملوکی سے فائدہ اٹھا کر یادووا اور ہائیسالر کے دو ماتحت خاندانوں نے اپنی حکومتیں قایم کریں۔[۱]

دسویں صدی میں چولا خاندان کو عروج حاصل ہوا۔ بارھویں صدی کے نصف آخر میں ایسے حکمران تخت نشین ہوئے، جن میں نہ قابلیت تھی، نہ قوت تھی اور نہ صلاحیت تھی اور نہ حکمرانی کی اہلیت! لہذا ماتحت کے صوبوں نے اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ماتحتی کا طوق دور کیا، پانڈیا نے جداگانہ حکومت قایم کر لی اور تیرھویں صدی میں جنوبی ہند کی دو طاقتور حکومتوں میں سے ایک تھی۔[۲]

تیرھویں صدی کی ربع آخر اور چودھویں صدی کے اوائل میں دکن حسب ذیل چار ممتاز سلطنتوں میں منقسم تھا۔

۱ دیوگیری کی یادوہری مملکت، جس کے آخری راجہ رامچندر نے سنہ ۱۲۷۱ء سے سنہ ۱۳۱۱ء تک حکومت کی۔

۲ تلنگانہ کی مملکت، جس کے ماتحت مشرقی دکن کا نصف حصہ بھی تھا، اور رانی رودرامبا جو خاندان کاکتیا سے تھی، حکمران تھی، اور ورنگل پایۂ تخت تھا، اس نے اپنے پوتے پرتاب رودر کو سنہ ۱۲۹۱ء میں تخت نشین کرایا۔ جس نے سنہ ۱۳۲۵ء تک حکومت کی۔

۳ ہائیسالر کی مملکت، جس کے ماتحت ہنتاپور اور نیلور کا تمام شمالی حصہ تھا۔

۴ اور تمام جنوبی حصہ ہند پر پانڈیہ قابض تھے۔[۳]

الغرض دکن کی یہ حالت تھی، اور ہر ایک حکومت اپنا اقتدار مستحکم اور اپنی قلمرو کے وسیع کرنے کی فکر میں تھی، اور ایک دوسرے سے باہم برسرپیکار تھی، جبکہ پہلی دفعہ شمالی ہند سے مسلمان دکن پر حملہ آور ہوئے اور فاتح کی حیثیت سے اس ملک کو اپنی قلمرو میں شامل کیا۔

بادی النظر میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس حملہ کے بعد ہی مسلمان پہلی دفعہ دکن میں آئے، حالانکہ یہ امر واقعہ نہیں ہے، شمالی ہند کے مسلمانوں کے حملے کے بعد ہی مسلمان پہلی دفعہ جنوبی ہند میں داخل نہیں ہوئے، بلکہ مغربی ساحل ہند سے مسلمانوں کے تجارتی تعلقات اس سے پہلے قایم ہو چکے تھے۔

ظہور اسلام کے بعد بہت سے مسلمان خاندانوں نے ساحل کے مختلف مقامات میں سکونت اختیار کر لی تھی، جن کا اصل مقصد تجارت تھا۔ عربی خصلت یا خصوصیات کے مسلمان خاندان جو تمام مشہور بندرگاہوں اور ملابار میں بس گئے تھے، انھوں نے ایک مرکب نسل پیدا کی جس نے شمالی ہند کے حملہ آور مسلمانوں کے ساتھ شرکت کی اور نہ لڑائیوں میں کوئی حصہ لیا۔[۴]

تاریخ سلطنت میں بعض اوقات عظیم الشان انقلابات محض اتفاق سے وقوع میں آئے ہیں۔ اسی محض اتفاقات کے زمرہ میں دکن کا پہلا حملہ بھی

[۱] History of the Marathe Peopl e by. Kincaid & Parsenis P. 33.
[۲] South India & Her Mohammadan Invuders by Aiyungar P. 1
[۳] South India & Her Mohammadan Invaders by Aiyungar P. 68 & 69.
[۴] South Ind & Her Moham n adan Invaders by Aiyangar P. 74

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو کی دوکان بہت مشہور ہے

شامل کیا جا سکتا ہے، جب شمالی ہند میں مسلمانوں کے قدم آئے تو ایک مدت تک کسی نے جنوبی ہند کی جانب توجہ نہ کی ہند و خاندان کے راجہ جنوبی ہند پر حکمراں رہے، لیکن جب غزنویوں اور غوریوں کے بعد خاندانِ غلامان نے شمالی ہند میں مستقل حکومت قایم کر لی، اور ان کے بعد خاندان خلجی کا عروج ہوا تو جلال الدین خلجی کا بھتیجا علاؤ الدین خلجی کچھ مال و دولت کی خواہش سے کچھ ایسے ملک کو تسخیر کرنیکے عزم سے جس کی طرف اُس سے پیشتر کسی اور مسلمان بادشاہ نے توجہ نہیں کی تھی سنہ ۱۲۹۴ء میں محض اتفاقاً دکن پر حملہ آور ہوا، روزِ ازل سے جس کی قسمت میں دکن کا پہلا مسلمان فاتح ہونا لکھا تھا وہ بھی حوصلہ مند سلطان تھا۔

علاؤ الدین گورنر کڑہ جب بھیلسان میں تھا تو اُس کو خبر ملی کہ رام دیو راجہ دکن کئی قرن کا خزانہ موروثی رکھتا ہے، اور وہ ایسا خزانہ ہے جو کسی بادشاہ دہلی کو اب تک میسر نہیں آیا، تو وہ کڑہ کی طرف واپس گیا اور وہاں سے بقول فرشتہ سات آٹھ ہزار سوار[۱] اور بقول ضیاء الدین برنی مولف تاریخ فیروز شاہی تین چار ہزار سوار ہمراہ لیکر اس نے دیوگیری کا عزم کیا۔[۲] کوچ در کوچ سرحد دکن یعنی بمقام لاجور گھٹی پہنچا اور وہاں ڈیرے ڈال دیے۔

امن و امان کے زمانہ میں یعنی سنہ ۱۲۹۴ء میں کسانوں کے ایک دہشت زدہ گروہ نے راجہ رام دیو کو جبکہ وہ پایہ تخت دربار میں بیٹھا ہوا تھا یہ وحشت ناک خبر پہنچائی کہ افغانوں کی فوج علاؤ الدین کی سرکردگی میں جلد جلد کوچ کرتی ہوئی آ رہی ہے۔[۳] رام دیو نے مقابلہ کے لئے لشکر روانہ کیا، لیکن وہ مسلمانوں کی ضرب شمشیر کی تاب نہ لا سکا، ایسا پسپا ہوا کہ دیوگیری ہی میں آکر دم لیا، اس فوج کو شکست دیکر علاؤ الدین فاتحانہ طور پر دیوگیری میں داخل ہوا۔ پے در پے شکست سے رام دیو سراسیمہ ہو چکا تھا، مجبوراً صلح پر راضی ہوا اور اطاعت و فرمانبرداری کا اعلان کیا، اس قدر زر و جواہر حاصل ہوا کہ اس کی تفصیل باعثِ طوالت ہے بہر حال بیان کیا جاتا ہے کہ چھ سو من طلا سات من مروارید اور دو من جواہر لعل و یاقوت وغیرہ ملے، اور یہ شرط قرار پائی کہ وہ ہر سال محصول ادا کرے گا۔[۴]

علاؤ الدین کی واپسی کے بعد رام دیو نے تاراج شدہ پایہ تخت کو از سرِ نو آباد کرنے کی کوشش کی بسنہ ۱۳۰۶ء میں علاؤ الدین کی تخت نشینی کے دس سال بعد جبکہ علاؤ الدین کی قوت شمالی ہند میں مستحکم ہو گئی اور اس کو اندرونی انتظامات سے فرصت ملی تو اُس نے دکن کی تسخیر کا اور دیوگیری کو سلطنت کا ایک صوبہ بنانیکا تہیہ کیا، بظاہر حملہ کی وجہ یہ تھی کہ رام دیو نے سرکشی سے چند سال سے خراج ادا نہ کیا تھا، لہذا اس کا انسداد ضروری سمجھکر ملک نایب کافور ہزار دیناری کو سائبان و سراپردہ شاہی عطا کرکے امرا نامدار کے ساتھ روانہ کیا اور حکم دیا کہ ملک کافور کی رائے سے اختلاف نہ کریں، اور خواجہ حاجی کو جو عارض ممالک کا نایب تھا برائے کار فرمائی حشم، عارض لشکر مقرر کرکے موافق روایت تاریخ جہاں آرا مصنفہ قاضی احمد غفاری ایک لاکھ فوج کے ساتھ سنہ ۱۳۰۶ء میں دکن کی طرف روانہ کیا۔[۵]

ملک نائب دکن میں پہنچا تو رعایائے دکن خوف سے کانپنے لگی، مگر اُس نے سب پر شفقت و مہربانی کرکے مطیع و منقاد بنایا اور دیوگیر کو تاراج کرکے رام دیو کو

[۱] تاریخ فرشتہ جلد اول۔ صفحہ ۱۴۲

[۲] تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۲۲۲

[۳] History of Marathu People by Kincaid & Persenis P.38

[۴] تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۱۴۳ و ۱۴۴، اور تاریخ فیروز شاہی ۲۲۳

[۵] تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۱۶۰ و تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۳۲۶

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر ملتا ہے

مع بیٹوں کے گرفتار کیا اور خزانہ شاہی بھی حاصل کیا اور خود ملک نائب مظفر و منصور دیوگیر سے روانہ ہوکر دہلی پہنچا، عمدہ تحائف کے ساتھ رام دیو کو سلطان کے حضور میں پیش کیا، سلطان نے اسکو سرفراز کیا اور رائے رایان کا خطاب۔ چتر سفید اور دیوگیر کی حکومت عطا کرکے عزت افزائی کی، رام دیو اس تاریخ کر وفات تک برابر اطاعت گذار رہا اور کبھی حلقۂ اطاعت سے باہر نہیں ہوا[1]

۷۰۹ھ یا ۱۳۰۹ء میں ملک کافور لشکر عظیم کے ساتھ ورنگل کی طرف دیوگیر کی راہ سے روانہ کیا اور حکم دیا کہ اگر حاکم ورنگل ہر سال خراج دینے کا وعدہ کرے تو اسی پر اکتفا کرنا، جب ملک نائب اور خواجہ حاجی دیوگیر پہونچے تو راجہ رام دیو نے لشکر اسلام کا پرجوش استقبال کیا، اور بہت پیش کش کے ساتھ پوری پوری مہمان داری کا حق ادا کیا۔ اکثر قصبات اور گاؤں کو فتح کرکے ملک کافور ورنگل پہنچا اور سنگین قلعہ ورنگل کا محاصرہ کیا، ورنگل کا راجہ امان کا طالب ہوا اور ہر سال خراج دینے کا وعدہ کیا[2]

اب سرحد کابل سے لیکر انتہائے بنگالہ تک اور گجرات و دکن کے بہت قلعے اور صوبے سلطان علاؤالدین کے زیر فرمان ہو چکے تھے لہذا اب اس نے چاہا کہ راس کماری کے حدود اور سواحل بحر ہند و لنکا کو مسخر کرے۔ چنانچہ جنوب بعید کے فتح کرنے کے لئے ۷۱۰ھ/۱۳۱۰ء میں سلطان علاؤالدین نے ملک کافور کو نامزد کرکے دہور سمندر اور معبر کی فتح کے لئے روانہ کیا، اس سنہ میں ہائیسالہ خاندان کا خاتمہ ہوا، گو اس سے پہلے یادو دی راجاؤں نے شمال کی طرف سے دباؤ ڈالکر ان کو جنوب کی طرف بڑھنے پر مجبور کیا تھا، تاہم وہ موجودہ ریاست میسور کے ایک بڑے حصہ پر حکومت کر رہے تھے جن کا پایۂ تخت دہور سمندر تھا۔ لیکن اب مسلمانوں کی فوج ملک نائب کی سرکردگی میں تمام جزیرہ نما ہند پر ایک سیلاب عظیم کی طرح پھیل گئی، ملک نائب نے ہائیسالہ خاندان کے پایۂ تخت کو لوٹ کر قبضہ کر لیا، چولا اور پانڈو دونوں خاندان کا جڑ پیڑ سے قلع قمع کر دیا۔ اس کے بعد معبر کی طرف لشکر کشی کی اور اس کو بھی فتح کرکے بیشمار مال غنیمت کے ساتھ کوچ پر کوچ کرکے ۷۱۱ھ/۱۳۱۱ء میں دہلی پہنچا[3]

جب دیوگیری کے راجہ نے خراج ادا نہ کیا تو ملک دوبارہ دکن پر حملہ آور ہوا، دیوگیری کو تباہ و برباد کر دیا، اور شنکر کو قتل کر دیا (۱۳۱۲ء) ملک نے مہاراشٹر کو تاراج کر دیا اور اس کی فوج نے تمام جنوبی ہند میں ایک تہلکہ ڈالدیا، یادوا۔ چولا۔ پانڈیہ اور چرا کی تمام قدیم مملکتیں یکے بعد دیگرے برباد ہوگئیں[4]
اس وقت سے سلطان علاؤالدین کی وفات تک جو ۱۳۱۵ء عیسوی میں واقع ہوئی جنوبی ہند پر مسلمانوں نے کوئی حملہ نہ کیا، سلطان دکن اور جنوبی ہند کے حملوں میں بہت کامیاب رہا، گو دور دراز کی مملکتیں قلمرو سلطانی میں داخل نہیں کی گئیں تاہم وہ اس قدر تابع اور مطیع بنالی گئی تھیں کہ سلطنت کا ایک جزو تصور کی جاسکتی ہیں[5]

علاؤالدین خلجی کی وفات کے بعد طوائف الملوکی اور بدنظمی پھیلی، مرکزی حکومت کی قوت کم ہو جانے کی وجہ سے باجگزار راجاؤں نے سرکشی کی اور خود مختار

[1] تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۱۰۷ اور تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۳۲۶

[2] تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۱۰۱ اور تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۳۲۰ و ۳۳۰

[3] تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۱۰۲ اور تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۳۳۳

[4] A History of the Mahratta People by Kincaid p.46

[5] South India and her Mohamedan Invaders

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگائیے

ہوگئے لیکن اس کے بعد جب خسرو کو قتل کرکے سلطان غیاث الدین تغلق نے تاج شاہی سر پر رکھا تو پھر حکومت کو استقلال حاصل ہوا۔ ۱۳۲۵ء میں غیاث الدین کی وفات پر محمد تغلق تخت نشین ہوا، اس نے اپنی تمام توجہ جنوبی ہند کو مطیع کرنیکی طرف مبذول کی ۱۳۲۷ تا ۱۳۳۰ء میں اس نے تلنگانہ، جنوبی کونکن اور دہور سمندرا کو مطیع کیا۔[۵۱]

۱۳۳۰ء کے اختتام پر سلطان محمد کی سلطنت اس قدر وسیع ہوگئی تھی کہ نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد مسلمانوں کے عہد حکومت میں کبھی ایسی رہی، سوناگاؤں سے گجرات تک اور لاہور سے ملابار تک کے ممالک اس کی قلمرو میں داخل تھے۔

اتنی وسیع سلطنت کی حکمرانی کے لئے ایسی قابلیت، استقلال، دوراندیشی اور تدبر کی ضرورت تھی جو سلطان محمد میں نہ تھی اس لئے سلطنت کو کمال عروج حاصل ہونیکے بعد زوال شروع ہوا، اور ایسی عظیم الشان سلطنت تھوڑے ہی عرصہ میں مختلف حصوں میں تقسیم ہوگئی اور ہر علاقہ میں ایک خودمختار حکمراں نے اپنی بادشاہی کا اعلان کیا، سب سے پہلے بنگال نے علم بغاوت بلند کیا

جب سلطان محمد بمقام ملتان، ساہو افغان کی بغاوت کرنے میں مصروف تھا، اور عام طور پر سلطنت میں ایک قسم کی بدامنی پھیلی ہوئی تھی جس کی وجہ سے مملکت کی حالت نازک ہورہی تھی، تو اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے ورنگل اور کرناٹک کے راجاؤں نے اتفاق کرکے فتنہ برپا کیا، کیتانائک دکن میں زور آور ہوچکا تھا، اس نے سرکشی کی، ملک مقبول نایب وزیر ان فتنوں سے گھبرا کر دہلی بھاگ گیا، اسی دوران میں کیتا کے رشتہ داروں نے بھی علم بغاوت بلند کیا۔[۵۲]

۱۳۲۳ء میں ورنگل کے فتح ہونے کے بعد ہریہرا اور بکا جو پرتاب دیو حاکم ورنگل کی خدمت میں تھے وہاں سے بھاگ کر کنپلہ میں سکونت اختیار کرلی تھی، ان کی خدمات سے خوش ہوکر کنپلہ کے راجا نے ان کو وزیر اور خزانہ دار مقرر کیا تھا جب سلطان محمد نے کنپلہ کو تباہ کیا تو یہ جان بچاکر بھاگ گئے اور بعدازاں ملک کے خلاف جو وہاں کا حاکم تھا سازش میں لگے رہے، ان کی چالاکی سے سلطان محمد تغلق نے ملک کو وہاں سے ہٹاکر ہریہر کو کنپلہ کا راجہ مقرر کیا عقلمندی و دوراندیشی سے دریائے تنگ بھدرا کے جنوبی کنارہ پر ایک نیا شہر وجیانگر آباد کرکے کنپلہ کی بجائے اس کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔[۵۳] اس طرح دکن کے مفتوحہ ممالک ایک ایک کرکے ہاتھ سے نکل گئے۔ اور سوائے گجرات و دیوگیری کے سلطان کے قبضہ میں کوئی اور ملک نہ رہا۔[۵۴]

جب سلطان نے دوآب کی طرف کوچ کیا اور سرگ واری کو صدر مقام بنایا، اور مصروف انتظام تھا کہ اس کو خبر ملی کہ دکن میں نصرت خاں باغی ہوگیا ہے اور علی شاہ ظفر خاں کے بھتیجے نے بھی گلبرگہ میں فساد کیا ہے تو سلطان نے ان کے انسداد کیلئے قتلغ خاں حاکم دیوگیری کو نامزد کیا، اس نے بیدر کا محاصرہ کیا اور نصرت خاں کو قول و قرار اور عہد و پیمان کے ذریعہ قلعہ سے برآمد کرکے سلطان کی خدمت میں بھیجا، پھر علی شاہ کو شکست دیکر فتح کی خوشخبری کے ساتھ اس کو بھی سلطان کی خدمت میں روانہ کیا۔ اس کے بعد سلطان نے قتلغ خاں کو جو عدل و انصاف اور حسن سلوک میں اپنا نظیر نہ رکھتا تھا دکن سے

۵۱ Elliot's History of India

۵۲ تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۴۰۳

۵۳ Sewell's Forgotten Empire "chap II"

۵۴ تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۴۰۴

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو سے منگانا چاہیے

طلب کیا، اور نظام الدین المخاطب بہ عالم الملک کو دیوگیر کا اور آذر حمار کو مالوہ کا حاکم مقرر کیا۔[۵۱] انہیں کمزور حاکموں کے تقرر کی وجہ سے ایسی عظیم الشان سلطنت کا زوال شروع ہوا۔[۵۲]

اول تو مسلمان امرا سلطان محمد تغلق کی طرز حکومت سے ناراض تھے اس پر سلطان نے امیران صدہ سے ناراض ہو کر ان کے قتل کا تہیہ کیا، جس طرح آگے چلکر معلوم ہوگا کہ دکن کی بغاوت کا اصلی سبب یہی امیران صدہ ثابت ہوئے، بہرحال سلطان نے ملک علی سرجامدار اور ملک احمد لاجین کو عالم الملک سپہ سالار دکن کے پاس بھیجکر یہ فرمان روانہ کیا کہ ایک ہزار پانسو سوار اور مشہور معروف امیران صدہ کو ان ایلچیوں ہمراہ بھروچ روانہ کرے، عالم الملک نے رائچور مدگل۔ گلبرگہ۔ بیجاپور۔ گنجوٹی کے امیران صدہ کو نہایت کوشش سے دولت آباد میں جمع کر کے سلطان کی خدمت میں روانہ کیا، جب وہ مانک دون پہنچے تو سلطان کی سیاست سے خائف اور ہراساں ہو کر انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ ان کی طلبی قتل کے واسطے ہے لہذا مناسب یہ ہے کہ وہاں سے کوچ کر کے واپس چلے جائیں اور علم بغاوت بلند کریں، جب ملک احمد لاجین مانع ہوا تو اس کو قتل کر کے مال و اسباب لوٹ لیا اور دولت آباد کی طرف روانہ ہوئے وہاں پہنچکر اس کا محاصرہ کر لیا، چند روز میں قلعہ پر قبضہ کر لیا اور خزانہ کو آپس میں تقسیم کر لیا، اور باہم مشورہ کر کے اسمٰعیل مخ کو بادشاہ تسلیم کیا، اور اس کو ناصر الدین شاہ کا خطاب دیکر سر پر چتر لگایا، اور حسن گانگو کو ظفر خاں کے خطاب سے سرفراز کیا، حسن نے بھیرن رائے حاکم گلبرگہ کو جو سلطان کا ہوا خواہ تھا قتل کر کے گلبرگہ پر تسلط ہوا، غرض دکن چو برسوں کی کوشش کے بعد فتح ہوا تھا تین مہینے کے اندر سلطان کے قبضہ سے نکل گیا، گجرات اور بڑودہ کے امیران صدہ بھی آ کر ان کے شریک ہوئے، ان کی قوت بڑھ گئی اور انہوں نے دکن میں فتنۂ عظیم برپا کیا۔ جب سلطان کو اس فساد کی خبر بھروچ میں ملی تو کوچ پر کوچ کرتا ہوا دولت آباد پہنچا، ناصر الدین شاہ بھی مقابلہ کے لئے نکلا سلطان نے اس کو شکست دی اس کے بعد امیران صدہ نے آپس میں مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ قلعہ بند ہو کر مقابلہ کرنا بہتر ہے۔ چنانچہ اسمٰعیل مخ دھارا گیر میں قلعہ نشین ہو گیا، اور حسب مشورہ باقی امرا اپنی اپنی جاگیروں میں چلے گئے، اور حسن گلبرگہ کی طرف روانہ ہوا، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ میدان میں سلطان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے، لہذا انہوں نے اسی میں مفاد دیکھا کہ فی الحال منتشر ہو جائیں اور جب سلطان دکن سے چلا جائے تو پھر دولت آباد میں جمع ہو کر آئندہ کے لئے کوشش کریں جب سلطان عازم تسخیر قلعۂ دھارا گیر ہوا تو اسی اثناء میں اس کو خبر ملی کہ حاکم گجرات نے سلطان کے نائب کو قتل کر کے بھروچ کا محاصرہ کر لیا ہے اس اطلاع کے ملنے پر سلطان خداوند زادہ قوام الدین اور دیگر امراء کو محاصرہ کے لئے نامزد کر کے خود گجرات کی طرف روانہ ہوا۔[۵۳]

سلطان کے جاتے ہی امیران صدہ کو اچھا موقع ہاتھ آیا، حسن گانگو ایک جرار فوج کے ساتھ بیدر کی طرف روانہ ہوا۔ جہاں عماد الملک عسکر سلطانی کے ساتھ ٹھیرا ہوا تھا، تلنگانہ کے راجہ نے بھی حسن کی مدد کی، قلعہ بیدر کے قریب بہت بھاری لڑائی ہوئی عماد الملک اس جنگ میں مارا گیا، اور سارا لشکر تتر بتر ہو گیا، اس فتح کے بعد حسن، ناصر الدین شاہ کی امداد کے لئے روانہ ہوا، سلطان محمد کی طرف سے جو امرا محاصرہ کئے ہوئے تھے حسن کے خوف سے دہلی اور گجرات بھاگ گئے اور حسن نہایت اطمینان کے ساتھ شہر میں داخل ہوا، ناصر الدین شاہ نے جب دیکھا کہ زیادہ تر امرا حسن کی طرف رجوع ہیں اور انکی

---

۵۱ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۰۱

۵۲ South India & her Mohamedan Invaders P.45

۵۳ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۰۳ و تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۵۱۳ و ۵۱۵ و ۵۱۶

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ملتا ہے

بہت عزت کرتے ہیں تو اُس نے خود ہی سلطنت سے دست کشی کی اور جمیع امیران صدہ نے ناصر الدین شاہ کی تجویز کے مطابق حسن گانگو کو بادشاہ مقرر کیا اور ۷۴۸ھ میں مبارک شاہ خلجی کی مسجد واقع دولت آباد میں اُس کے سر پر تاج سلطانی رکھا، اور تیمناً و تبرکاً چتر سیاہ جو خلفائے عباسیہ کا بانا تھا لوازم شاہی میں داخل کیا۔ تمام ملک دکن میں اسی کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ حسن نے گلبرگہ کو مبارک خیال کر کے اُسے اپنا دار السلطنت مقرر کیا اور حسن آباد نام رکھا۔

سلطان گجرات کی مہم میں مصروف تھا کہ یہ متوحش خبر دکن کے وقائع نگار نے پہنچائی، سلطان یہ خبر سُنکر بحد غمگین ہوا، لیکن یہ سمجھکر کہ مخلوق اُس سے ناراض ہے اور تمام فسادات اس کی کثرت سیاست کی وجہ سے بپا ہوئے ہیں چند روز کے لئے سیاست سے دست کش ہوا اور مصلحت وقت دیکھکر خاموشی اختیار کی۔ اور بدستور گجرات اور کرنال کی تسخیر میں مصروف رہا[۵۱]

۱۳۵۱ء میں سلطان کا انتقال ہوا، اس کی وفات کے وقت وہ سلطنت جو بیس سال قبل اسی کے عہد حکومت میں درہ ہائے مغربی سے دہانہ گنگا تک پھیلی ہوئی تھی گھٹ گھٹا کر بالکل کم رہگئی[۵۲]

سلطان علاؤ الدین حسن گانگو نے اپنی حسن تدبیر رائے صائب و ضرب شمشیر سے تھوڑی ہی مدت میں اس قدر ملک دکن فتح کر لیا جس قدر کہ تغلق کے عہد میں اس کے امرا کے تصرف میں تھا، البتہ دیجانگر کا علاقہ اس سے علیحدہ رہا، امرائے تغلق وافغان وراجپوت کو جو سلطان کی جانب سے قلعہ بیدر و قندھار میں تھے لطف و ملائمت سے مطیع و منقاد کیا، کولاس مع مضافات رائے ورنگل سے لیلیا، ادھر محمد تغلق ملک طغی کی بغاوت فرو کرنے میں ایسا مصروف رہا کہ اُس کو تا زیست دکن کی جانب توجہ کرنے کی فرصت نہ ملی حسن نے ایک مہم کرناٹک کی طرف بھیجی اس میں بھی کامیابی ہوئی وہاں کے راجاؤں نے سالانہ خراج ادا کرنیکا عہد کیا۔

امرائے گجرات نے محمد تغلق کی سختیوں کی تاب نہ لا کر حسن کو بلوایا، حسن خود تو نہیں گیا مگر اپنے بیٹے شہزادہ محمد کو بھیجدیا اور بعد خود بھی عقب سے روانہ ہوا، جب شہزادہ قصبہ نوساری پہنچا تو وہاں شکار کی کثرت دیکھی اُس نے سلطان (یعنی حسن) کو شکار کی دعوت دی، یہاں آنے کے چند دن بعد سلطان ہیضہ میں مبتلا ہوا، اور اسی سلسلہ میں مختلف عوارض میں مبتلا رہکر ۱۳۵۸ء میں انتقال کیا، اس کے انتقال کے وقت اس سلطنت میں ملک مرہٹواڑی، تلنگانہ اور کرناٹک کے بھی کچھ حصے شامل تھے جن پر ہندو راجہ حکمراں تھے، مشرق میں راجہ تلنگا اور جنوب میں راجہ بیجانگر، کرناٹک پر مسلط تھے، یہ دونوں بڑے زبردست مد مقابل تھے، جب سلطان حسن امور سلطنت میں مشغول ہوا تو جیسا کہ اس کے سزاوار اور لائق تھا اُس نے سلطنت اور جہانداری کا کام نہایت عمدگی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا، روز بروز اس کی مملکت وسیع ہوتی گئی، دریائے پونہ سے قلعہ ادھونی کے اطراف تک اور جیول و دابل سے شہر احمد آباد بیدر تک کا ملک اس کے حوزۂ تصرف میں تھا[۵۳]

سلطان علاؤ الدین حسن گانگو کے انتقال کے بعد سلطان محمد تخت نشین ہوا۔ اُس نے ممالک محروسہ کو چار حصوں میں تقسیم کیا اور ہر حصہ پر ایک ایک

۵۱ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۰۳ و ۲۰۴ و تاریخ فیروز شاہی صفحہ ۵۱۴ و ۵۱۵ و ۵۱۶۔

۵۲ South India & her Mohammedan Invaders

۵۳ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۹۶

مشکی زردہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ملتا ہے

طرفدار مقرر کیا۔ اُس کے زمانہ میں ورنگل کے راجہ نے سرکشی کی اور چاہا کہ قلعہ جات ورنگل و رائچورا واپس لیلے، لیکن سلطان محمد نے ورنگل کے راجہ کو شکست دی، تین دفعہ ورنگل پر چڑہائی کرنی پڑی، آخر کار ۷۶۵ھ میں رائے تلنگ نے متواتر دو وقت شکست کہانے کے بعد تیسری دفعہ مقابلہ کیلئے تیاری کی اور رائے بیجانگر کو اپنا حلیف بنانے میں کامیاب ہوا۔ سلطان نے بہی عظیم الشان تیاری کی اور زور دار حملہ کیا۔ لشکر کے دو حصے کئے کچھ ورنگل اور کچھ سکندرہ کی طرف بہیجا۔ رائے تلنگ کو رائے بیجانگر سے کچھ مدد نہ ملی اور اس نے کامل شکست پائی، گولکنڈہ مع مضافات دیکر صلح کرلی، اسی سلطان نے رائے بیجانگر پر چڑہائی کی اور اس کو کامل شکست دی، آخر کار مجبور ہو کر بیجانگر کے راجہ نے محمد شاہ کے پاس ایلچی بھیجے اور عفو تقصیر کا خواستگار ہوا۔ یہ بادشاہ عقیل و شجیع اور نہایت اولوالعزم اور عالی حوصلہ تھا، سپاہ کے ساتھ بہت ہی خلق و مروت کے ساتھ پیش آتا تھا، لیکن دشمنوں کے لئے نہایت سخت گیر تھا، جس سلطنت کی بنیاد سلطان علاؤالدین نے ڈالی تھی اُس کو استحکام اسی کے عہد میں حاصل ہوا، اس کے بعد جو بادشاہ سریر آرائے سلطنت ہوئے، اُن کے زمانہ میں رقبۂ مملکت وسیع ہوتا گیا۔ اور اندرونی انتظامات حکومت کو استقلال پہنچاتے گئے۔ تا آنکہ محمد شاہ ثانی کا زمانہ آیا۔ اس کے عہد حکومت میں سلطنت بہت وسیع ہوگئی۔ اُس نے بجائے چار قسمتوں کے اپنی قلمرو کی آٹھ قسمتیں قرار دیں اور ہر ایک قسمت پر ایک ایک طرفدار مقرر کیا۔ خوش قسمتی سے اس کو خواجہ محمود گاوان جیسا شیر ملگیا، جو تدبر و سیاست اور انتظام مملکت میں ملکہ تام رکھتا تھا۔ محمود سلطنت کا سچا خیر خواہ تھا، اور سلطان محمد شاہ ثانی سے اُس کو نہایت درجہ اخلاص تھا، اسی کی کوششوں اور حسن سعی کا نتیجہ تھا کہ سلطنت کو وہ عروج ہوا، جو اس سے پہلے نہ اسکے بعد کسی اور بادشاہ دکن کے زمانہ میں حاصل ہوا۔ محمد شاہ کی بیس سالہ حکومت میں سلطنت عروج کمال کی انتہائی مدارج کو پہنچکر زوال پذیر ہوئی، اس کے عروج و زوال کا اصلی سبب خواجہ محمود کی ذات میں مضمر ہے، یہ وہ حسرتناک اور جانسوز و دلخراش داستان ہے جو خون کے آنسو رلاتی ہے، ایک خادم کو اپنی خیر خواہی اور حسن خدمات کا وہ صلہ ملا کہ اس نے نہ صرف اس کو بلکہ سلطنت بہمنیہ کو برباد کر دیا ؎

بیگناہ محمود گاوان شد شہید

جنوب کی طرف صرف بیجانگر کا علاقہ باقی رہگیا تھا، ممکن تھا کہ ایک سال کے اندر ہی اندر بیجانگر کی سلطنت کا نام و نشان بھی باقی نہ رہتا مگر مشیت ایزدی دوسری طرح تھی، امرا کو خواجہ محمود کی روز افزوں ترقی و اقتدار کو دیکھکر حسد پیدا ہوا، اور انھوں نے خواجہ کی دشمنی پر کمر باندہی انہوں نے خواجہ کے ایک حبشی غلام کو ملا کر بہ دغا و فریب ایک سادہ کاغذ پر خواجہ کی مہر لگالی، اور اس کے بعد ایک جعلی خط تیار کیا جس میں خواجہ کی طرف سے راجہ اڑیسا کو لکھا کہ "اگر تم اس وقت سلطنت پر حملہ آور ہو تو میں تمہاری امداد کروں گا، اس وقت سلطنت کی حالت نازک ہورہی ہے اچھا موقع ہے"[۵۱]

جب وہ جعلی رقعہ سلطان کی خدمت میں پیش کیا گیا، سلطان خواجہ کی مہر دیکھتے ہی بہت برافروختہ ہوا۔ اور عنان اختیار دست اقتدار سے چھوٹ گئی اور بدوں استفسار اور دریافت حقیقت حال خواجہ کی طلبی کے لئے آدمی بھیجا اور خواجہ کے قتل کا حکم دیا۔ ایک غلام نے خیر خواہ سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔[۵۲] ایک ایسی زبردست شخصیت کے اٹھ جانے کی وجہ سے ملک میں بدامنی پھیلی، خود غرض امرا سرکشی پر آمادہ ہوئے نشہ میں سرشار بادشاہ بہی زیادہ عرصہ تک چین سے حکومت نہ کرسکا۔ خواجہ کے قتل کے ایک ہی سال بعد ۸۸۷ھ میں اُس نے وفات پائی اس میں کوئی شک نہیں کہ جس ضرب کی

۵۱ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۵۱۵

۵۲ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۵۱۵

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگائیے

خواجہ محمود کا کام تمام کیا گیا، اُسی ضرب نے سلطنت بہمنیہ کا طبقہ الٹ دیا۔ سلطان محمد شاہ کی موت سلطنت بہمنیہ کی موت تھی، امرا نے اس کی وفات کے بعد علم بغاوت بلند کیا، اور ہر طرف خود غرض امرا شخصی اقتدار قایم کرنے کی فکر میں پڑ گئے سامعی نے اس بادشاہ کی تاریخ وفات کہی ہے ؎

دکن چوں شد خراب از زفتن او

خرابی دکن تاریخ او شد[۵۱]

خواجہ کے قتل کی خبر سُنکر عماد الملک اور خداوند خان اپنا اپنا لشکر لیکر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بے سبب خواجہ کو قتل کرنے پر اظہار افسوس کیا، اسی دوران میں یوسف عادل خان بھی آ گیا بادشاہ نے بیجاپور کا تمام علاقہ جو خواجہ کے ماتحت تھا، یوسف کو عطا کیا۔ حسن نظام الملک بحری جس کی سازش کی وجہ سے خواجہ قتل کیا گیا تھا سلطنت کا نائب اور پیشوا مقرر کیا گیا۔[۵۲] اس کے بعد بادشاہ نے ادھا دھند سلطنت کے جملہ امور نظام الملک کے سپرد کر دیے بادشاہ کی اس کارروائی سے تمام امرائے ترک بددل ہو گئے چونکہ یوسف عادل خاں کی قوت بہ نسبت دیگر امرا کے بہت بڑھی ہوئی تھی اس لئے بادشاہ اسکی خرابی کے درپے ہوا، اور اسے دور دور کی مہمات پر روانہ کرنا شروع کیا۔[۵۳] جب یوسف عادل خاں کو محمد شاہ کی وفات اور محمود شاہ کی تخت نشینی کی خبر ملی، تو مبارکباد کے لئے دار الخلافہ آیا، چونکہ نظام الملک اور یوسف عادل خاں کے تعلقات اچھے نہ تھے اور دونوں میں چشمک تھی اور وہ اس کی ہر لعزیزی اور قوت سے متوہم تھا اس لئے اس کے درپے آزار ہوا، اور اس کے خلاف سازش شروع کی۔

چونکہ نظام الملک کی سختی اور خود غرضانہ مختاری کی وجہ سے امرا بددل ہو گئے تھے اس لئے دلاور خان حبشی نے بادشاہ کو یہ باور کرا کے کہ اس نے بادشاہ کو عضو معطل بنا رکھا ہے اس کا کام تمام کرنیکا مشورہ دیا، جس پر بادشاہ نے اپنی رضامندی ظاہر کی چنانچہ دل پسند خاں نے نظام الملک کو قتل کر کے اس کا سر بادشاہ کی خدمت میں بھیجا۔[۵۴]

بادشاہ عیش و نشاط میں مصروف ہوا، اور ملک کی حالت دن بدن خراب ہوتی گئی، صورت حال کو اپنے موافق دیکھکر حکام اپنے استحکام کی کوشش میں پڑ گئے تھوڑی ہی مدت میں بادشاہ کے تصرف میں مملکت تلنگ اور حوالی و حواشی بیدر کے سوا کوئی علاقہ نہ رہا، گو اس وقت تک تمام طرفدار سوائے ملک احمد بحری (فرزند نظام الملک) کے ظاہری اطاعت کرتے تھے، لیکن ملک احمد نے باپ کے قتل کی خبر سنکر بغاوت کی اور بیر اور تمام کوکن کے علاقہ پر قبضہ کر لیا خود بادشاہ بن کر اپنے نام کے ساتھ نظام الملک کا خطاب بھی اڑا دیا، اور اپنے ایلچی عادل خاں اور عماد الملک کے پاس بھیجکر ان کو بھی خود مختاری کے اعلان کرنیکا مشورہ دیا۔[۵۵]

اسی زمانہ میں قاسم برید منصب وکالت پر مامور ہوا، اور ایسا ذی اثر ہو گیا کہ سلطان محمود برائے نام بادشاہ رہا، تمام امور مملکت اسی کے ذریعہ انجام پاتے۔

۵۱ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۵۲۱

۵۲ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۵۲۰

۵۳ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۵۲۰

۵۴ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۵۲۵ و صفحہ ۵۲۷

۵۵ تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۵۳۰

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو سے ملتا ہے

اسی وجہ سے مورخین سلطنت بریدیہ کی ابتدا اسی سال ۹۰۹ھ سے شمار کرتے ہیں[۵۱]
الغرض مملکت بہمنیہ پانچ سلطنتوں میں تقسیم ہوگئی۔

۱ عادل شاہی

۲ نظام شاہی

۳ عماد شاہی

۴ قطب شاہی

۵ برید شاہی

گو محمود شاہ کے بعد بھی خاندان بہمنیہ کے چار اور بادشاہ تخت نشین ہوئے لیکن ان کی بادشاہت برائے نام تھی، اور وہ بریدیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کے مانند تھے؛

ان پانچ سلطنتوں کے قائم ہوجانے کے بعد ان سلطنتوں کے تعلقات کی داستان نہایت وضاحت کی محتاج ہے، بقول پروفیسر بنی پرشاد:-

"دکن کی ان پانچ سلطنتوں کی سیاسی تاریخ اندرونی نفاق اور بیرونی حملوں کا ایک وسیع دفتر ہے، ہندوؤں کی عظیم الشان سلطنت، بیجانگر کا وجود اس الجھاؤ اور دقتوں میں اور اضافہ کا باعث ہوئی، بظاہر یہ ممکن نظر نہیں آتا تھا کہ بیجاپور اور گولکنڈہ کی سیاسیات، جنوبی اثر سے متاثر ہونگی، لیکن رام راج کے بڑھے ہوئے حوصلوں نے بیجاپور، گولکنڈہ اور احمد نگر کو باہمی اتحاد پر مجبور کیا، اور اتحادیوں نے اس سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجادی ۱۵۶۹ء کی جنگ تالیکوٹہ نے بیجانگر کی سلطنت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردیا۔"[۵۲]

شمالی ہند میں کسی مستحکم قوت کی نہونے کی وجہ سے دکن کو سیاسی فروغ کے لئے بہت اچھا موقع ملا، بالآخر سولہویں صدی میں اسی قدیم طرز عمل کا اعادہ کیا گیا جو دو ہزار سال سے شمال اور جنوب کے درمیان جاری تھا۔ یعنی جب شمالی ہند میں اکبر کی سلطنت مستحکم ہوگئی تو شمالی اور جنوبی ہند کے درمیان جنگ و جدال کا سلسلہ شروع ہوا، برار، احمد نگر کا جزو ہوچکا تھا، بیدر کی قوت انحطاط پذیر تھی، او صرف خاندیس، احمد نگر، گولکنڈہ، اور بیجاپور کی ایسی سلطنتیں تھیں جن سے اکبر کو مقابلہ کرنا تھا۔

۱۵۹۱ء میں اکبر نے اس سلطنتوں کے پاس ایلچی بھیجے تاکہ بغیر جنگ و جدال کے کام نکل آئے، سب سے پہلے خاندیس کی مختصر سی ریاست نے اطاعت اختیار کی، دیگر سلطنتوں نے گول مول جواب دیا۔[۵۳]
دکن کے دول کے درمیان خانہ جنگی تھی خصوصاً احمد نگر اور بیجاپور کی تاریخ تو جنگ و جدال کا مرقع ہے۔ احمد نگر میں مرتضیٰ نظام شاہ اور گول کنڈہ میں

۵۱ تاریخ فرشتہ جلد اول صا۳۱۵
۵۲ History of Jahangir By Beni Pd.
۵۳ Elliot' History of India

محمد قلی قطب شاہ اور بیجاپور میں ابراہیم عادل شاہ حکومت کر رہے تھے، قطب شاہی اور نظام شاہی افواج ابراہیم عادل شاہ کی کمسنی سے فایدہ اٹھانے کے لئے حملہ آور ہوئی لیکن بالآخر صلح ہوگئی ۹۹۲ھ میں ابراہیم عادل شاہ کی ہمشیرہ کا نکاح مرتضیٰ نظام شاہ کے بیٹے میران نظام شاہ سے ہوا۔ اور ۹۹۵ھ میں ابراہیم عادل شاہ نے محمد قلی قطب شاہ کی بہن سے نکاح کیا۔[۵۱]

برہان نظام شاہ نے دو دفعہ بیجاپور پر چڑھائی کی اور دونوں وقت شکست کھائی، اس کے بعد برہان نظام شاہ کا انتقال ہوگیا، اور احمد نگر کے تخت پر ابراہیم شاہ متمکن ہوا۔ احمد نگر کی اندرونی حالت ناگفتہ بہ تھی، وہاں دو فریق میاں منجھو اور اخلاص خاں بہت طاقتور تھے اور ایک دوسرے کے مخالف تھے، ایک فریق اکبر سے مقابلہ کرنا چاہتا تھا، اور دوسرا ابراہیم عادل شاہ سے مدافعت، آخر کار اخلاص خاں کی تحریک سے نظام شاہی فوج نے ابراہیم عادل شاہ کے علاقہ پر چڑھائی کی، ۱۵۹۵ء میں ابراہیم عادل شاہ نے ان کو کامل شکست دی، اور ابراہیم شاہ مارا گیا، جس کے مرنے کے بعد احمد شاہ تخت نشین ہوا[۵۲] چونکہ سلطنت احمد نگر حدود مغلیہ سے بہت قریب واقع ہوئی تھی اس لئے ۱۵۹۵ء اکبر نے شہزادہ دانیال کو مع خانخانان کے احمد نگر کی طرف روانہ کیا اور بعدہٗ بجائے دانیال کے مراد کو نامزد کیا، لیکن بقول صاحب طبقات اکبری "سپہ سالاروں کے درمیان اتفاق نہ تھا، لہٰذا اس باہمی نفاق اور دکن کے روپیہ نے ان کے بازوؤں کو شل کر دیا" علاوہ ازیں اس موقع پر چاند سلطانہ ہمشیرہ برہان نظام الدین شاہ نے قلعہ احمد نگر کی محافظت کا بیڑا اٹھالیا، بالآخر دونوں فریق صلح پر راضی ہوئے اور ۱۵۹۶ء میں صلح ہوگئی، جس کی رو سے برار کا الحاق مغلیہ سلطنت سے ہوگیا۔ اور احمد نگر نے مغلوں کے اقتدار کو تسلیم کرلیا۔ چاند سلطانہ نے آنیوالے خطرہ کو اچھی طرح محسوس کرلیا اور اس مشترکہ خطرہ کے خلاف بیجاپور اور گولکنڈہ کو متحد کیا، بعد ازاں خاندیس بھی شریک ہوگیا، لیکن اس متحدہ قوتوں کی مدافعت کے باوجود بھی مغلوں کو میدان سونپا میں فتح حاصل ہوئی، احمد نگر مفتوح ہوگیا مگر پوری طرح الحاق نہ ہوسکا۔

خانخانان کی فیروز جنگی پہلے سے مشہور تھی اس فتح سے اس کی اور بھی ناموری ہوگئی، مگر شاہزادہ مراد اور خانخانان میں کشیدگی پیدا ہوگئی، جس کی وجہ سے شہنشاہ اکبر نے شاہزادہ کی رعایت و خاطرداری ملحوظ رکھکر ۱۰۰۶ھ میں خانخانان کو واپس بلالیا۔ اور اس کی بجائے ابوالفضل کو اس عہدہ پر مامور کیا۔

لیکن پھر احمد نگر میں مخالفت شروع ہوئی اور اکبر جو سرحدی معاملات سے فراغت حاصل کر چکا تھا ۱۰۰۹ھ میں دکن کی طرف روانہ ہوا۔[۵۳] یہ معلوم کرکے کہ خاندیس بھی بغاوت پر آمادہ ہے خود اس طرف متوجہ ہوا، اور دانیال و خانخانان کو احمد نگر کی طرف بھیجا۔ ادھر احمد نگر میں اندرونی اختلافات، فساد و نااتفاقی اور بدنظمی نے چاند سلطانہ کا خاتمہ کر دیا، اکبر نے کچھ دنوں پیشتر شاہان بیجاپور اور گولکنڈہ کے پاس سفیر بھیجے تھے تاکہ وہ انکو اطاعت کرنے اور پیشکش کرنے پر آمادہ کریں۔ بیجاپور جو سفیر بھیجا گیا تھا اس نے اکبر کی زور و قوت کو کچھ اس طرح بیان کیا کہ ابراہیم عادل شاہ نے اطاعت قبول کرلی اور پیشکش روانہ کیا۔[۵۴]

(باقی ——— فروری میں دیکھئے)　　　سعید کی، بی، اے علیگ گلبرگہ

[۵۱] بساتین السلاطین صہ ۱۹۱ و ۱۹۲

[۵۲] بساتین السلاطین صہ ۲۲۸ و ۲۲۹

[۵۳] بساتین السلاطین صہ ۲۵۴

[۵۴] بساتین السلاطین صہ ۲۵۵

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر ملتا ہے

آغازِ ہستی

(ڈراما)

باب اوّل

باغ عدن۔ سہ پہر کا وقت۔ ایک بڑا سانپ اپنا سر پھولوں کی ایک کیاری میں چھپائے ہوئے اور اپنے جسم کو ایک درخت کی شاخوں میں لپیٹے ہوئے آرام کر رہا ہے درخت اچھی طرح پروان چڑھ چکا ہے کیونکہ آفرینش کے دن ہمارے قیاس سے کہیں زیادہ طویل تھے۔ سانپ اس شخص کو نہیں دکھائی دے سکتا جس کو اُس کی موجودگی کا علم نہیں ہے۔ کیونکہ اُس کے سبز اور بھورے رنگ کے میل سے دھوکا ہوتا ہے اس کے قریب پھولوں کی کیاری سے بلند ایک چٹان نظر آرہی ہے۔ یہ چٹان اور درخت دونوں ایک سبزہ زار کے کنارے واقع ہیں، جس میں ایک ہرن کا بچہ مرا اور سوکھا ہوا پڑا ہے، اُس کی گردن ٹوٹ گئی ہے، آدم اپنے ایک ہات کے سہارے چٹان پر جھکا ہوا مردہ جسم کو دہشت سے دیکھ رہا ہے، اُس نے اپنے بائیں طرف سانپ کو نہیں دیکھا ہے۔ وہ داہنے طرف مڑتا ہے اور گھبرا کر آواز دیتا ہے ——

آدم — حوّا! حوّا

حوّا — کیا ہے، آدم؟

آدم — یہاں آؤ۔ جلد کچھ ہوگیا ہے!

حوّا — (دوڑ کر) کیا کہاں؟ (آدم ہرن کے بچہ کی طرف اشارہ کرتا ہے) اُف! (وہ اُس کے پاس جاتی ہے۔ آدم کو بھی اُس کے ساتھ جانیکی جرأت ہوتی ہے) اس کی آنکھوں کو کیا ہوگیا؟

آدم — صرف آنکھیں نہیں، یہ دیکھو (اس کو ٹھکراتا ہے)

حوّا — ارے یہ نہ کرو۔ یہ جاگتا کیوں نہیں۔؟

آدم — معلوم نہیں، سو نہیں رہا ہے۔

حوّا — سو نہیں رہا ہے۔؟

آدم — دیکھو تو!

حوّا — (ہرن کے بچہ کو ہلانے اور اُٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے) یہ تو سخت اور ٹھنڈا ہوگیا ہے!

آدم — کوئی شے اس کو جگا نہیں سکتی۔

حوّا — اس میں تو عجیب مہک ہے۔ اُف (اپنا ہات جھاڑتی ہے اور اسکے پاس سے ہٹ جاتی ہے) کیا تمنے اسکو اسی حالت میں پایا تھا؟

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو کا تار کا پتہ صرف حنا کافی ہے

آدم نہیں ابھی کھیل رہا تھا کہ ٹھوکر کھا کر لڑکھڑاتا ہوا گر پڑا۔ پھر اُس نے جنبش تک نہیں کی اس کی گردن میں کوئی خرابی ہو گئی ہے (گردن اُٹھا کر حوّا کو دکھانے کے لئے جھکتا ہے)

حوّا مت چھوؤ، اس کے پاس سے ہٹ جاؤ۔ (دونوں پیچھے ہٹ جاتے ہیں اور چند قدم کے فاصلے سے لاش پر بڑھتی ہوئی نفرت سے غور کرتے ہیں)

حوّا آدم!

آدم ہاں۔

حوّا فرض کرو کہ تم ٹھوکر کھا کر گر پڑو تو کیا تم بھی اسی طرح چلے جاؤ گے۔

آدم اُف! (تھرا جاتا ہے اور چٹان پر بیٹھ جاتا ہے)

حوّا (اُس کے پہلو میں بیٹھ کر اور اُس کے گھٹنوں کو تھام کر) تم کو اسکا خیال رکھنا چاہیئے، وعدہ کرو کہ خیال رکھو گے۔

آدم خیال رکھنے سے فائدہ کیا؟ ہم کو یہاں ہمیشہ رہنا ہے، دیکھتی ہو ہمیشہ کے کیا معنی ہیں ایک نہ ایک دن میں بھی ٹھوکر کھا جاؤنگا اور گر پڑونگا ممکن ہے کل ہی، اور ممکن ہے اتنے دنوں بعد جتنی کہ اس باغ میں پتیاں ہیں یا دریا کے کنارے ریت کے ذرّے ہیں بہر حال میں بھول جاؤنگا اور ٹھوکر کھا جاؤنگا

حوّا میں بھی،

آدم (سہم کر) نہیں نہیں میں تمھارے جاؤنگا اور ہمیشہ کے لئے، تم کبھی اپنے کو اس خطرے میں نہ ڈالنا تم چلا نہ کرو، ساکت بیٹھی رہا کرو میں تمہاری حفاظت کروں گا، اور جس چیز کی تم کو ضرورت ہوگی، خود لا کر دوں گا۔

حوّا (جھجکتے ہوئے اُس کی جانب سے منہ پھیر کر اور اپنی کہنیوں کو تھام کر) میں اس طرح جلد گھبرا جاؤں گی۔ اس کے علاوہ تمہارا یہ انجام ہوا تو پھر میں تنہا رہ جاؤں گی، اس وقت بیکار بیٹھی نہ رہ سکوں گی اور آخر کار میرا بھی وہی انجام ہوگا۔

آدم اور پھر؟

حوّا پھر ہم نہیں ہوں گے۔ صرف چوپائے، پرندے اور سانپ ہونگے۔

آدم یہ نہ ہونا چاہیئے۔

حوّا ہاں نہ ہونا چاہیئے مگر ہو سکتا ہے۔

آدم نہیں، کہتا ہوں کہ نہیں ہونا چاہیئے، میں جانتا ہوں کہ ایسا نہیں ہوگا۔

حوّا ہم دونوں جانتے ہیں، لیکن کیسے جانتے ہیں؟

آدم باغ میں ایک "آواز" ہے جو مجھکو باتیں بتایا کرتی ہے۔

حوّا باغ تو آوازوں سے بھرا ہوا ہے، جو میرے سر میں نئے نئے خیالات لاتی رہتی ہیں۔

آدم میرے لئے صرف ایک آواز ہے جو بہت دھیمی ہے، لیکن اسقدر قریب ہے گویا میرے اندر سے آرہی ہے اس آواز میں اور چڑیوں کی یا چوپایوں کی یا خود اپنی آوازمیں کوئی دھوکا نہیں ہو سکتا۔

حوّا تعجب ہے کہ میں تو بہت سے آوازیں سنتی ہوں اور تم صرف ایک "آواز" اپنے اندر سے، لیکن میرے بعض خیالات ایسے بھی ہیں جو آوازوں کے ذریعہ سے نہیں بلکہ میرے اندر سے آتے ہیں۔ یہ خیال کہ ہم کبھی نیست نہیں میرے اندر سے آیا ہے۔

آدم لیکن ہم نیست ہو جائیں گے۔ اس ہرن کے بچہ کی طرح ہم بھی گر پڑینگے اور۔۔۔۔ (اُٹھکر گھبراہٹ میں ادہر ادہر ٹہلنے لگتا ہے) میں اس علم کی تاب نہیں لا سکتا، مجھے اس کی ضرورت نہیں میں تم سے کہتا ہوں ایسا نہیں ہونا چاہیئے، پھر بھی یہ نہیں جانتا کہ کس طرح رد کوں۔

حوّا میں بھی یہی محسوس کرتی ہوں، حیرت کی بات ہے کہ تم اس طرح

(اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو کے یہاں ہر قسم کا عطر ملتا ہے)

کر رہے ہو، تم کو کسی حالت میں چین نہیں تم ہمیشہ اپنا خیال بدلتے رہتے ہو۔

آدم (ڈانٹ کر) یہ کیوں کہتی ہو، میں نے اپنا خیال کب بدلا ہے۔؟

حوّا تم کہتے ہو کہ ہم کو نیست نہ ہونا چاہیئے لیکن پہلے تم اس کی شکایت کیا کرتے تھے کہ ہم کو یہاں ہمیشہ رہنا ہے، بعض اوقات تم گھنٹوں چپ چاپ سوچا کرتے ہو، اور دل ہی دل میں مجھ سے کڑھتے رہتے ہو، جب میں پوچھتی ہوں کہ میں نے کیا کیا ہے تو تم کہتے ہو تمہارے بارے میں نہیں بلکہ اپنے یہاں ہمیشہ رہنے کی مصیبت پر غور کر رہا تھا، مگر میں سمجھتی ہوں کہ تم جس چیز کو مصیبت کہتے ہو وہ یہاں ہمیشہ میرے ساتھ رہنا ہے۔

آدم تم یہ سوچتی ہو کیوں؟ نہیں تم غلطی پر ہو تو وہ پھر مضمحل بیٹھ جاتا ہے" اصل مصیبت تو ہمیشہ اپنے ساتھ رہنا، میں تم کو چاہتا ہوں لیکن اپنے کو نہیں چاہتا، میں کچھ اور ہونا چاہتا ہوں، اس سے بہتر میں چاہتا ہوں کہ میرا بار بار پھر سے آغاز ہوتا رہے جس طرح سانپ کینچلی بدلتا رہتا ہے اسی طرح میں بھی اپنے کو بدلتا رہوں، میں اپنے سے عاجز ہو گیا ہوں لیکن مجکو بہرحال برداشت کرنا ہے، ایک دن یا کئی دن کے لئے بلکہ ہمیشہ کے لئے یہ ایک ڈرا دینے والا خیال ہے۔ اسی پر میں خاموش غور کیا کرتا ہوں اور کڑھتا ہوں، کیا تم نے کبھی اس پر غور نہیں کیا؟

حوّا میں اپنے متعلق غور نہیں کرتی، اس سے کیا فائدہ؟ میں جو ہوں سو ہوں، کوئی چیز اس کو بدل نہیں سکتی میں تمہارے متعلق غور کرتی رہتی ہوں۔

آدم یہ ٹھیک نہیں، تم ہر وقت میری کھوج میں لگی رہتی ہو، تم کو ہمیشہ یہ جاننے کی فکر رہتی ہے کہ میں کیا کرتا رہتا ہوں یہ تو ایک بار معلوم ہوتا ہے، بجائے اس کے کہ اپنے کو میرے ساتھ مشغول رکھو تمکو یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ تمہارا ایک اپنا ذاتی وجود علیحدہ ہو۔

حوّا مجکو تمہارا خیال رکھنا ہے، تم سست ہو، میلے رہتے ہو۔ اپنی خبر نہیں رکھتے، ہردم خواب دیکھتے رہتے ہو، اگر میں اپنے کو تمہارے ساتھ مشغول نہ رکھوں تو تم خواب کھانا کھانے لگو گے اور قابلِ نفرت ہو جاؤ گے، اسپر بھی باوجود میری تمام نگرانی کے تم کسی روز سر کے بل گر پڑو گے اور مردہ ہو جاؤ گے۔

آدم مردہ؟ یہ کونسا لفظ ہے؟

حوّا (ہرن کے بچے کی طرف اشارہ کرکے) اس کی طرح میں اس کو مردہ کہتی ہوں۔

آدم (اٹھکر بچہ کے پاس جاتے ہوئے) اس میں کوئی غیر مانوس بات معلوم ہوتی ہے۔

حوّا (آدم کے پاس جاتے ہوئے) یہ تو سفید چھوٹے کیڑوں کی صورت میں تبدیل ہو رہا ہے!

آدم اس کو دریا میں پھینک آؤ، یہ ناقابلِ برداشت ہو رہا ہے۔

حوّا میں اس کو چھونے کی ہمت نہیں کرسکتی۔

آدم تو میں ہی پھینک آؤں اگرچہ مجھے اس سے کراہیت معلوم ہو رہی ہے، یہ ہوا کو زہریلا کر رہا ہے (سموں کو اپنے ہات میں لے کر لاش کو اپنے جسم سے جہانتک ممکن ہے دور لٹکائے ہوئے اسطرف جاتا ہے جس طرف سے حوا آئی تھی)

حوّا اس کی سمت ایک لمحہ تک دیکھتی رہتی ہے، پھر نفرت کی ایک لرزش کے ساتھ چٹان پر بیٹھ جاتی ہے اور کچھ سوچنے لگتی ہے۔ سانپ کا جسم دلکش نئے رنگوں سے چمکتا نظر آتا ہے، وہ پھولوں کی کیاری سے آہستہ سے اپنا سر اٹھاتا ہے اور حوا کے کان میں ایک عجیب دلفریب پر ترنم آواز میں کہتا ہے۔

سانپ حوا۔

حوّا کون ہے؟

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کا عطر بہت مشہور ہے

سانپ۔ میں ہوں، تم کو اپنا خوبصورت نیا پھن دکھانے آیا ہوں دیکھو۔ (وہ ایک خوشنما بیل میں اپنا پھن پھیلا دیتا ہے)

حوّا اہا! مگر تجھکو بولنا کس نے سکھایا؟

سانپ؛ تم نے اور آدم نے، میں گھاس میں چھُپکر تمہاری باتیں سنا کرتا ہوں!

حوّا یہ تیری بڑی عقلمندی ہے۔

سانپ، میں اس میدان کے جانوروں میں سب سے زیادہ ہوشیار ہوں

حوّا تیرا پھن بہت خوبصورت ہے (پھن کو تھپکتی ہے اور سانپ کو پیار کرتی ہے) اچھے سانپ کیا تو اپنی دیوی ماتا حوّا کو چاہتا ہے؟

سانپ میں اسکو پوجتا ہوں۔ (حوّا کی گردن کو اپنی دُہری زبان سے چاٹتا ہے)

حوّا (اس کو پیار کرتے ہوئے) حوّا کے پیارے سانپ، اب حوّا کبھی اکیلی نہ رہیگی کیونکہ اس کا سانپ باتیں کر سکتا ہے۔

سانپ میں بہت سی چیزوں کے بارے میں باتیں کر سکتا ہوں، میں بڑا عقلمند ہوں یہ میں ہی تھا جس نے تمہارے کان میں آہستہ سے وہ لفظ کہدیا تھا۔ جو تم کو نہیں معلوم تھا۔ مردہ۔ موت۔ مرنا۔

حوّا (کانپ کر) اس کی یاد کیوں دلاتا ہے؟ میں تیرا خوبصورت پھن دیکھکر اس کو بھول گئی تھی، تجھکو منحوس چیزوں کی یاد نہیں دلانا چاہئیے۔

سانپ موت منحوس چیز نہیں اگر تم نے اس پر فتح پانا سیکھ لیا ہے۔

حوّا میں موت پر فتح کیسے پا سکتی ہوں؟

سانپ ایک دوسری چیز کے ذریعہ سے جس کو پیدائش کہتے ہیں۔

حوّا (تلفظ کی کوشش کرتے ہوئے) پے۔ دائش؟

سانپ ہاں پیدائش۔

حوّا پیدائش کیا ہے؟

سانپ سانپ کبھی مرتا نہیں۔ تم کسی روز دیکھو گی کہ میں اس خوبصورت کیچل سے ایک نیا سانپ بنکر اور اس سے زیادہ خوبصورت کیچل لیکر باہر نکل آؤنگا یہی پیدائش ہے۔

حوا میں ایسا دیکھ چکی ہوں، بڑے تعجب کی بات ہے۔

سانپ میں بڑا ہوشیار ہوں، جب تم اور آدم باتیں کرتے ہو تو میں تم کو "کیوں" کہتے ہوئے سنتا ہوں، ہر دم "کیوں" تم آنکھوں سے چیزوں کو دیکھتی ہو اور کہتی ہو "کیوں؟" میں خواب میں دیکھتا ہوں اور کہتا ہوں "کیوں نہیں"؟ میں نے لفظ "مردہ" خود بنایا ہے، جس سے مراد میری پُرانی کیچل ہے جس کو میں نے تجدید کیوقت اتار کر پھینک دیا اس تجدید کو میں پیدا ہونا کہتا ہوں۔

حوّا "پیدا" ایک خوبصورت لفظ ہے۔

سانپ کیوں نہیں میری طرح بار بار پیدا ہوا اور ہمیشہ نئی اور خوبصورت بنی ہو؟

حوّا میں! اس لئے کہ ایسا ہوتا نہیں اور کیوں نہیں۔

سانپ مگر وہ "تو کیسے" ہوا "کیوں نہیں؟" "تو نہیں" حوّا بتاؤ "کیوں نہیں؟"

حوّا لیکن میں اس کو پسند نہیں کروں گی، پھر سے نیا بنجانا اچھی بات ہے مگر میری پرانی جلد زمین پر بالکل میری طرح پڑی رہیگی، آدم اسکو سکڑتے ہوئے دیکھے گا اور ——————

سانپ نہیں اس کی ضرورت نہیں، ایک دوسری پیدائش بھی ہے۔

حوّا دوسری پیدائش؟

سانپ سنو تم کو ایک بڑا راز بتاتا ہوں، میں بڑا عقلمند ہوں، میں سوچ چار بتا ہوں میں ارادہ کا پکا ہوں، اور جس چیز کی مجکو ضرورت ہوتی ہے اسکو حاصل کر لیتا ہوں، میں اپنے ارادہ سے کام لیتا رہا ہوں، اور میں نے عجیب عجیب چیزیں کھائی ہیں۔ پتھر سیب جن کو کھاتے ہوئے تم ڈرتی ہو۔

حوّا تمہاری یہ ہمت!

سانپ مجھے ہر بات کی ہمت ہوئی۔ اور آخر کار مجھے ایک ایسا طریقہ معلوم ہو گیا جس سے میں اپنی زندگی کا ایک جزو اپنے جسم کے اندر محفوظ رکھ سکوں۔

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کا تار کا پتہ صرف خدا کافی ہے

حوّا — زندگی کس کو کہتے ہیں؟

سانپ — وہ چیز جو مردہ اور جاندار ہرن کے بچہ میں تفریق کرتی ہے۔

حوّا — کیسا حسین لفظ ہے اور کیسی حیرت انگیز چیز ہے! زندگی تمام الفاظ میں سب سے پیارا لفظ ہے۔

سانپ — ہاں زندگی ہی پر غور و فکر کرنے سے میں نے معجزے دکھانے کی قوت حاصل کی ہے۔

حوّا — معجزے؟ پھر ایک نیا لفظ!

سانپ — معجزہ اس ناممکن بات کو کہتے ہیں جو بہرحال ممکن ہوتی ہے، کوئی ایسی بات جو نہیں ہو سکتی تھی، لیکن ہو جاتی ہے۔

حوّا — مجھے کوئی معجزہ بتاؤ جو تم نے کیا ہو۔

سانپ — میں نے اپنی زندگی کا ایک جزو اپنے جسم کے اندر اکٹھا (جمع) کیا اور اُس کو ایک خانہ میں بند کیا جو اُن پتھروں سے بنا تھا جن کو میں نے کھایا تھا۔

حوّا — اور اس سے کیا فائدہ ہوا؟

سانپ — میں نے اس چھوٹے خانہ کو دھوپ دکھائی اور سورج کی گرمی میں رکھ دیا وہ پھٹ گیا اور اُس میں سے ایک چھوٹا سانپ نکل آیا جو روز بروز بڑھتا گیا یہاں تک کہ میرے برابر ہو گیا۔ یہی تھی دوسری پیدائش۔

حوّا — اوہو! یہ تو بیحد حیرت انگیز ہے۔ یہ تو میرے اندر بھی حرکت کر رہی ہے اور مجھکو زخمی کئے ڈالتی ہے۔

سانپ — اُس نے قریب قریب مجھکو پھاڑ ڈالا تھا، مگر اس پر بھی میں زندہ ہوں اور پھر اپنی جلد کو پھاڑ کر اپنے کو اسی طرح پیدا کر سکتا ہوں، عنقریب عدن میں اتنے سانپ ہو جائیں گے جتنے کہ میرے جسم پر چوٹے ہیں اس وقت موت کچھ نہ کر سکیگی یہ سانپ اور وہ سانپ مرتے رہیں گے لیکن سانپ باقی رہے گا۔

حوّا — مگر سانپ کے علاوہ ہم سب کبھی نہ کبھی مر جائیں گے اور تب کچھ اور باقی نہ رہیگا ہر جگہ سانپ ہی سانپ رہجائیں گے۔

سانپ — یہ نہ ہونا چاہئے۔ حوا میں تم کو پوجتا ہوں، میرے پوجنے کے لئے کوئی نہ کوئی چیز ہونی چاہئیے جو تمہاری طرح مجھ سے بالکل مختلف ہو کوئی چیز سانپ سے برتر ضرور ہونی چاہئیے۔

حوّا — ہاں یہ نہ ہونا چاہئیے۔ آدم نیست نہو، تم بڑے عقلمند ہو، بتاؤ میں کیا کروں؟

سانپ — سوچو۔ ارادہ کرو۔ مٹی کھاؤ، سفید پتھر کو چاٹو، اس سیب کو چکھو جس سے تم ڈرتی ہو، سورج تم کو زندگی دیگا۔

حوّا — سورج پر مجھکو بھروسہ نہیں میں خود زندگی دونگی، میں اپنے جسم کو چیر کر دوسرا آدم نکالوں گی خواہ ایسا کرنے میں میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کیوں نہ ہو جائیں۔

سانپ — ضرور ہمت کرو۔ ہر بات ممکن ہے ہر بات سنو۔ میں بڈھا ہوں۔ آدم اور حوّا سے بھی بڈھا ہوں مجھے اب تک للتھ[1] یاد ہے جو آدم و حوّا سے پہلے تھی جس طرح میں تم کو عزیز ہوں اسی طرح اس کو بھی تھا۔ وہ تنہا تھی اُس کے ساتھ کوئی مرد نہ تھا، جس طرح ہرن کے بچہ کو گرا ہوا دیکھکر تم نے موت دیکھ لی اسی طرح اُس نے بھی دیکھ لیا تھا تب اُس کو خیال ہوا کہ از سر نو پیدا ہونیکی اور میری طرح اپنے کو بدلنے کی کوئی تدبیر نکالنی چاہئیے، اس کا ارادہ زبردست تھا، وہ کوشش کرتی رہی اور جتنی اُس باغ کے درختوں میں

[1] عام طور پر یہ روایت مشہور ہے کہ للتھ آدم کی پہلی بیوی تھی، شوہر کی نافرمانی کی سزا میں وہ باغ عدن سے نکالدی گئی، کہا جاتا ہے کہ وہ اب بھی دنیا میں موجود ہے مگر نظر نہیں آتی۔ وہ حوّا کی اولاد کی دشمن ہے چنانچہ امّ الصبیان کی بیماری اسی سے منسوب کی جاتی ہے لیکن برنرڈ شا للتھ کو آدم اور حوّا دونوں کی ماں خیال کرتے ہیں۔

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو سے عطر خا منگائیے

پتیاں ہیں ان سے بھی زیادہ مہینوں تک ارادہ کرتی رہی، اس کا کرب خوفناک تھا، اس کی کراہ نے عدن کو خواب سے محروم کر دیا تھا اُس نے کہا اب "ایسا ہونا چاہیئے تجدید زندگی کا بار برداشت سے باہر ہے ان کے لئے یہ تکلیف بہت زیادہ ہے"، اور جب اس نے اپنا جسم بدلا تو ایک للتؔ نہ تھی بلکہ دو تھیں۔ ایک تمہاری طرح دوسری آدم کی طرح - ایک حوا تھی، دوسرا آدم تھا۔

حوا لیکن اس نے اپنے کو دو میں کیوں تقسیم کیا اور کیوں ہمکو ایک دوسرے سے مختلف بنایا۔؟

سانپ کہتا تو ہوں کہ یہ محنت ایک کی برداشت سے بہت زیادہ ہے اس میں دو کو شریک رہنا چاہیئے۔

حوا کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ میرے ساتھ آدم کو بھی اس تکلیف میں شریک ہونا پڑیگا؟ نہیں وہ نہیں شریک ہوگا، وہ اس محنت کو برداشت نہیں کر سکتا اور نہ جسم پر کوئی تکلیف اٹھا سکتا۔

سانپ اس کی ضرورت نہیں اس کے لئے کوئی محنت نہ ہوگی، وہ خود شریک ہونے کے لئے تم سے التجا کریگا، وہ اپنی خواہش کے ذریعہ سے تمہارے قابو میں ہوگا۔

حوا تب تو میں ضرور کرونگی، لیکن کیسے؟ للتؔ نے اس معجزہ کو کیسے کیا تھا؟

سانپ اس نے تصور کیا۔

حوا "تصور کیا" کیا چیز ہے؟

سانپ اس نے مجھ سے ایک ایسے واقعہ کی دلچسپ داستان بیان کی جو ایک ایسی للتؔ پر کبھی نہیں گزرا، جو کبھی نہیں تھی، للتؔ کو اس وقت تک یہ نہیں معلوم تھا کہ تصور آفرینش کا آغاز ہوتا ہے، تم بھی جس چیز کی تم کو خواہش ہو اُس کا تصور کرو اس کا ارادہ کرو اور آخر کار جس چیز کا ارادہ کروگی اس کو پیدا کر لوگی۔

حوا محض عدم سے میں کیوں کر کوئی چیز پیدا کر سکتی ہوں؟

سانپ ہر چیز عدم ہی سے پیدا ہوئی ہوگی، اپنے مضبوط پر گوشت کو دیکھو، یہ ہمیشہ وہاں نہیں تھا۔ جب میں نے پہلے پہل تم کو دیکھا تو تم درخت پر نہیں چڑھ سکتی تھیں، مگر تم ارادہ کرتی رہو اور کوشش کرتی رہو اور تمہارے ارادہ نے محض عدم سے تمہارے بازوؤں پر گوشت کا یہ لوتھڑا پیدا کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ تمہاری خواہش پوری ہوگئی اور تم ایک ہات کے سہارے اپنے کو اوپر کھینچکر درخت کی اس ڈال پر بیٹھ جانے کے قابل ہوگئی جو تمہارے سر سے اونچی تھی۔

حوا وہ تو مشق تھی۔

سانپ مشق سے چیزیں گھس جاتی ہیں، بڑھتی نہیں، تمہارے بال ہوا میں لہرا رہے ہیں جیسے کھنچکر بڑھ جانے کی کوشش کر رہے ہوں، لیکن باوجود اس مشق کے وہ بڑھ نہیں پاتے صرف اس لئے کہ تم نے ارادہ نہیں کیا ہے۔ جب للتؔ نے جو کچھ تصور کیا تھا، اس کو خاموش زبان میں (کیونکہ اس وقت تک الفاظ نہیں تھے) مجھ سے بیان کیا تو میں نے اس کو صلاح دی کہ خواہش کرو نیز ارادہ کرو اور ہم کو یہ دیکھکر حیرت ہوئی کہ جس چیز کی اس نے خواہش کی تھی اور ارادہ کیا تھا وہ اس کے ارادہ کی تحریک سے خود بخود اس کے اندر پیدا ہوگئی، تب میں نے بھی ارادہ کیا کہ اپنے کو بدلکر بجائے ایک کے دو بنالوں، اور بہت دنوں بعد یہ معجزہ ظاہر ہوا؛ میں اپنی پرانی جلد سے باہر نکلا اس حالت میں کہ ایک دوسرا سانپ مجھ سے لپٹا ہوا تھا۔ اور اب پیدا کرنے کے لئے دو تصور ہیں دو خواہشیں ہیں دو ارادے ہیں۔

حوا خواہش کرنا، تصور کرنا۔ ارادہ کرنا پیدا کرنا۔ یہ تو بہت طویل داستان ہے مجھے اس کے لئے کوئی ایک لفظ بتا۔ تو تو الفاظ کا ماہر ہے۔

سانپ جنّنا اس سے دونوں مراد ہیں۔ تصور سے ابتدا کرنا اور پیدائش پر

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر ملتا ہے۔

ختم کر دینا۔

حوا: مجھکو اس داستان کے لئے کوئی ایک لفظ بتا جس کا للتھ نے تصور کیا اور جس کو تجھ سے خاموش زبان میں بیان کیا، وہی داستان جو اس قدر عجیب و غریب تھی کہ سچ نہیں ہو سکتی تھی اور پھر بھی سچ ہو گئی۔

سانپ: ایک شعر

حوا: للتھ میری کون تھی۔ اب اس کے لئے کوئی لفظ بتا۔

سانپ: وہ تمہاری ماں تھی۔

حوا: اور آدم کی بھی؟

سانپ: ہاں

حوا: (اٹھکر) میں جاتی ہوں اور آدم سے جننے کے لئے کہتی ہوں۔

سانپ: (قہقہہ لگاتا ہے) !!!

حوا: (پریشان ہو کر اور چونک کر) کیسی نفرت انگیز آواز ہے! تجھکو ہو کیا گیا ہے؟ اس سے پہلے کسی کے منہ سے ایسی آواز نہیں نکلی۔

سانپ: آدم نہیں جن سکتا

حوا: کیوں؟

سانپ: للتھ اس کو ایسا تصور نہیں کیا۔ وہ تصور کر سکتا، خواہش کر سکتا اور ارادہ کر سکتا۔ وہ اپنی زندگی کو سمیٹ کر ایک سحر چشمہ تخلیق کے لئے محفوظ رکھ سکتا ہے وہ سب کچھ پیدا کر سکتا ہے، بجز ایک چیز کے اور وہ ایک چیز اس کی اپنی جنس ہے۔

حوا: للتھ نے اس کو محروم کیوں رکھا؟

سانپ: اس لئے کہ اگر وہ ایسا کر سکتا تو اس کو حوا کی ضرورت نہ ہوتی۔

حوا: ٹھیک ہے تو جننا مجھکو ہو گا۔

سانپ: ہاں، اسی ذریعہ سے وہ تم سے وابستہ ہے۔

حوا: اور میں اس سے!

سانپ: ہاں تاوقتیکہ تم دوسرا آدم نہ پیدا کر لو۔

حوا: مجھے اس کا تو خیال ہی نہ تھا۔ تو بڑا ہوشیار ہے۔ لیکن اگر میں دوسری حوا پیدا کروں تو ممکن ہے وہ اس کی طرف مائل ہو جائے، اور بغیر میرے رہ سکے، میں کوئی حوا نہیں پیدا کروں گی صرف آدم ہی آدم پیدا کروں گی۔

سانپ: بغیر حوا کے آدم اپنی زندگی کی تجدید نہ کر سکیں گے، کبھی نہ کبھی تم ہرن کے بچے کی طرح مر جاؤ گی اور پھر نئے آدم بغیر حوا کے پیدا کرنے سے معذور رہیں گے، تم اپنے انجام کا تصور تو کر سکتی ہو لیکن اس کی خواہش نہیں کر سکتی اس سے ارادہ نہیں کر سکتیں اس لئے صرف آدم ہی آدم پیدا نہیں کر سکتیں۔

حوا: اگر ہرن کے بچے کی طرح مجھکو مرنا ہے، تو جو کچھ باقی ہے وہ بھی کیوں نہ مر جائے؟ مجھے اس کی فکر نہیں۔

سانپ: زندگی کو رکنا نہیں چاہیئے یہ سب سے پہلی بات ہے۔ یہ کہنا دانی ہے کہ تم کو فکر نہیں، تم کو ضرور فکر ہے۔ یہی فکر ہے جو تمہارے تصور کو، ابھارے گی، تمہارے خواہشوں کو بڑھائے گی تمہارے ارادے کو اٹل بنائے گی، اور آخرکار محض عدم سے پیدا کرے گی

حوا: (سوچتے ہوئے) محض عدم جیسی تو کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ باغ بھرا ہوا ہے خالی نہیں ہے۔

سانپ: میں نے اس پر نہیں غور کیا تھا یہ ایک زبردست خیال ہے، ہاں محض عدم جیسی کوئی چیز نہیں، البتہ ایسی چیزیں ہیں جن کو ہم دیکھتے نہیں، گرگٹ بھی ہوا کھاتا ہے۔

حوا: میں نے ایک اور بات سوچی ہے، میں اس کو آدم سے کہونگی (آواز دیتے ہوئے) آدم، آو! آو!

آدم کی آواز: او! او!

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی کے یہاں ملے گا

حوّا — اس سے وہ خوش ہوگا اور اس کی افسردگی کے دور ہونے کا علاج ہو جائیگا۔

سانپ — اس سے ابھی کچھ نہ کہو، میں نے تم کو زبردست راز نہیں بتایا ہے۔

حوّا — اب اور کیا بتاتا ہے؟ یہ معجزہ میرا کام ہے۔

سانپ — نہیں اس کو بھی خواہش اور ارادہ کرنا ہے، مگر اس کو اپنی خواہش اور ارادہ تم کو دیدینا ہوگا۔

حوّا — کیسے۔؟

سانپ — یہی تو بڑا راز ہے۔ چپ! وہ آرہا ہے۔

آدم — (واپس ہوتے ہوئے) کیا باغ میں ہماری آواز اور اس "آواز" کے علاوہ کوئی اور آواز بھی ہے؟ میں نے ایک نئی آواز سنی تھی۔

حوّا — (اٹھتی ہے اور دوڑ کر اس کے پاس جاتی ہے) ذرا سوچو آدم! ہمارے سانپ نے ہماری باتیں سن سن کر بولنا سیکھ لیا ہے۔

آدم — (خوش ہوکر) واقعی؟ (وہ اس کے قریب سے ہوکر پتھر کے پاس جاتا ہے اور سانپ کو پیار کرتا ہے)

سانپ — (پیار سے جواب دیتا ہے) ہاں واقعی پیارے آدم۔

حوّا — مجھکو اس سے بھی زیادہ حیرت ناک باتیں کہنی ہیں آدم اب ہم کو ہمیشہ رہنے کی ضرورت نہیں۔

آدم — (جوش میں سانپ کا سر چھوڑ دیتا ہے) کیا! حوّا اس معاملہ میں مجھ کو کھیل نہ کرو۔ کاش کسی روز خاتمہ ہو جاتا، اور اس طرح کہ گویا نہیں ہوا۔ کاش میں ہمیشہ رہنے کی مصیبت سے نجات پاتا۔ کاش اس باغ کی برداخت کسی دوسرے مالی کے سپرد ہو جاتی اور جو نگہبان اس "آواز" کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے وہ آزاد ہو جاتا۔ کاش خواب اور سکون جو روز آنہ مجھکو یہ سب کچھ برداشت کرنے کے قابل بنائے ہوئے ہیں ایک مدت میں دائمی خواب اور سکون ہو جاتے۔ بہرکیف کسی نہ کسی صورت سے خاتمہ ہونا چاہیئے۔ مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ "دوام" کو برداشت کرسکوں۔

سانپ — تم کو آئندہ گرمی تک بھی رہنے کی ضرورت نہیں۔ اور پھر بھی کوئی خاتمہ نہیں ہوگا۔

آدم — یہ نہیں ہو سکتا۔

سانپ — ہو سکتا ہے۔

حوّا — اور ہوگا۔

سانپ — ہو چکا ہے۔ مجھکو مار ڈالو اور کل باغ میں تم دوسرا سانپ دیکھو گے تمہارے ہاتھوں میں جتنی انگلیاں ہیں ان سے بھی زیادہ سانپ تم کو ملیں گے۔

حوّا — میں دوسرے آدم اور حوّا پیدا کروں گی۔

آدم — میں نے کہدیا کہ قصے نہ گڑھو۔ یہ نہیں ہو سکتا۔

سانپ — مجھے یاد ہے جب تم خود ایک ایسی چیز تھے جو نہیں ہو سکتی تھی، مگر پھر بھی تم ہو۔

آدم — (متعجب ہوکر) یہ تو سچ ہوگا (پتھر پر بیٹھ جاتا ہے)

سانپ — میں اس راز کو حوا سے کہدوں گا، اور وہ تم کو بتادیگی۔

آدم — (جلدی سے سانپ کی طرف مڑتا ہے اور اس حالت میں اسکی پاؤں کسی تیز چیز پر پڑ جاتا ہے) اف!

حوّا — کیا ہوا؟

آدم — کانٹا ہے، ہر جگہ کانٹے ہیں۔ باغ کو خوشگوار بنانے کے لئے ان کو ہمیشہ صاف کرتے کرتے تھک گیا۔

سانپ — کانٹے جلد نہیں بڑھتے ابھی ایک مدت تک باغ ان سے بھر نہیں سکے گا۔ اس وقت تک نہیں بھر سکتا جب تک کہ تم اپنا بوجھ اتار کر ہمیشہ کیلئے سونے نہ چلے جاؤ۔ تم اس کے واسطے کیوں پریشان ہو ہونے آدم کو اپنے لئے اپنی جگہ خود صاف کرنے دو۔

آدم — یہ ٹھیک ہے تو اپنا راز ہم کو بتادے۔ دیکھو حوّا ہمیشہ کے لئے

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر مل سکتا ہے

اگر رہنا نہ پڑے تو کیسا اچھّا ہو۔

حوّا (بےچینی کے ساتھ زمین پر بیٹھکر گھاس اکھاڑتے ہوئے) مرد کی یہی حالت ہے، یہ معلوم کرتے ہی کہ ہم کو ہمیشہ کے لئے نہیں رہنا ہے اس طرح باتیں کرنے لگے، گویا آج ہی ہمارا خاتمہ ہونیوالا ہے، تم کو ان خطرناک چیزوں کو صاف کرنا ہے نہیں تو جب کبھی بے خبری میں ہم قدم اٹھائیں گے تو گھایل ہو جائیں گے۔

آدم ہاں۔ صاف تو ضرور کرنا ہے لیکن تھوڑا ہی۔ کل میں ان سب کو صاف کر ڈالونگا۔

سانپ (قہقہہ لگاتا ہے) !!!

آدم یہ عجیب شور ہے، مجھکو بھلا معلوم ہوتا ہے۔

حوّا مجھکو نہیں بھلا معلوم ہوتا۔ تو یہ شور پھر کس لئے کرتا ہے؟

سانپ آدم نے ایک نئی چیز ایجاد کی ہے یعنی "کل" اب جبکہ بقا کا بوجھ تمہارے سر سے اٹھ گیا ہے تم روز نئی چیزیں ایجاد کرو گے۔

آدم بقا؟ یہ کیا ہے؟

سانپ یہ میرا لفظ ہے جس سے مراد ہمیشہ کے لئے زندہ رہنا ہے۔

حوّا سانپ نے "ہونے" کے لئے ایک خوبصورت لفظ بنایا ہے "زندگی"

آدم میرے لئے کوئی ایسا خوبصورت لفظ بنا دے جس سے کل کام کرنا مراد ہے، کیونکہ یقیناً یہ ایک زبردست اور متبرک ایجاد ہے۔

سانپ ٹالنا

آدم بڑا پیارا لفظ ہے۔ کاش میں بھی سانپ کی سی زبان پائے ہوتا۔

سانپ یہ بھی ہو سکتا ہے ہر بات ممکن ہے۔

آدم (یکایک دہشت میں چونک پڑتا ہے) ارے!

حوا میرا سکون! زندگی سے میری نجات!

سانپ "موت" اس کے لئے یہ لفظ ہے۔

آدم ٹالنے میں بڑا خطرہ ہے۔

حوّا کیا خطرہ؟

آدم اگر موت کو کل پر ٹالدوں تو میں کبھی نہیں مرونگا "کل" کوئی دن نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔

سانپ میں بڑا عقلمند ہوں، مگر انسان سوچنے میں مجھ سے بھی زیادہ گہرا ہے، عورت جانتی ہے کہ "محض عدم" کوئی چیز نہیں۔ مرد جانتا ہے کہ "کل" کوئی دن نہیں، میں۔ میں ان کو پوجتا ہوں، بجا کرتا ہوں

آدم اگر موت کو پانا ہے تو مجھکو کوئی اصلی دن مقرر کرنا چاہیئے۔ کل نہیں۔ مجھکو کب مرنا چاہیئے۔

حوّا جب میں دوسرا آدم پیدا کر لوں تو تم مرجانا، مگر نہیں تمہارا جب جی چاہے مرجاؤ، وہ اٹھتی ہے اور آدم کے پیچھے سے بے پروائی کے ساتھ ٹہلتی ہوئی درخت کے پاس جاتی ہے اور اس کے سہارے کھڑی ہو کر سانپ کے حلقوں کو تھپکتی ہے۔

آدم پھر بھی کوئی جلدی نہیں ہے

حوّا معلوم ہوتا ہے کہ تم اسکو کل پر ٹالوگے۔

آدم اور تم؟ کیا تم دوسری حوّا پیدا کرتے ہی مرجاؤ گی۔

حوّا میں کیوں مروں؟ کیا تم مجھ سے چھٹکارا پانا چاہتے ہو؟ ابھی تم چاہتے تھے کہ میں ساکت بیٹھی رہوں اور چلا نہ کروں تا کہ کہیں ہرن کے بچہ کی طرح ٹھوکر کھا کر مر نہ جاؤں۔ اور اب تم کو میری کوئی پروا نہیں۔

آدم اب اس میں اتنا ہرج نہیں ہے۔

حوّا (سانپ سے غصہ میں) یہ موت جس کو باغ میں سے آیا ہے ایک بلا ہے، وہ چاہتا ہے کہ میں مرجاؤں۔

سانپ (آدم سے) کیا تم چاہتے ہو کہ وہ مرجائے۔

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کی ایک شاخ گلزار حوض حیدرآباد دکن میں ہے

آدم نہیں مرنا مجکو ہے، حوّا کو مجھ سے پہلے نہیں مرنا چاہیئے۔ میں اکیلا رہجاؤنگا۔

حوّا تم دوسری حوّا پاؤ گے۔

آدم یہ تو ٹھیک ہے، مگر ممکن ہے وہ بالکل تمہاری طرح نہ ہوں، اور ہو نہیں سکتیں، اس کو تو میں خوب محسوس کر رہا ہوں، ان کی وہ یادگاریں نہ ہونگی۔ وہ کیا ہوں گی؟ میں ان کے لئے ایک لفظ چاہتا ہوں۔

سانپ اجنبی۔

آدم ہاں یہ ایک اچھا اور ٹھوس لفظ ہے۔ اجنبی۔

حوّا جب نئے آدم اور نئی حوّا ہونگی تو ہم اجنبیوں کے باغ میں ہونگے ہم کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے (فوراً آدم کے پیچھے آجاتی ہے اور اس کے چہرے کو اپنی طرف اٹھاتی ہے) آدم اس بات کو کبھی نہ بھولنا۔ ہرگز نہ بھولنا۔

آدم میں کیوں بھولوں گا؟ میں نے تو اس کو سوچا ہے۔

حوّا میں بھی ایک بات سوچی ہے، ہرن کا بچہ ٹھوکر کھا کر گر پڑا، اور مر گیا۔ لیکن تم چپکے سے میرے پیچھے آسکتے ہو اور (وہ اچانک اس کے کندھوں کو دھکا دیتی ہے اور اس کو منہ کے بل ڈھکیل دیتی ہے) مجکو اس طرح ڈھکیل سکتے ہو کہ میں مر جاؤں، اگر میرے پاس یہ دلیل نہ ہوتی کہ تم میری موت کی کوشش نہیں کروگے تو میں سونے کی ہمت نہ کرتی۔

آدم (مارے دہشت کے درخت پر چڑھنے لگتا ہے) تمہاری موت کی کوشش! کیسا بھیانک خیال ہے۔

سانپ مار ڈالنا۔ مار ڈالنا۔ مار ڈالنا۔ یہ لفظ ہے۔

حوّا نئے آدم و حوّا ہم کو مار ڈالیں گے۔ میں ان کو نہیں پیدا کرونگی (وہ چٹان پر بیٹھ جاتی ہے۔ آدم کو نیچے کھینچکر اپنی بغل میں کر لیتی ہے، اور اپنے داہنے ہاتھ سے اس کو پکڑے رہتی ہے)

سانپ تم کو پیدا کرنا ہوگا۔ کیونکہ اگر نہیں پیدا کروگی تو خاتمہ ہو جائیگا

آدم نہیں وہ ہم کو مار ڈالیں گے۔ وہ ہماری طرح محسوس کرینگے کوئی چیز اس کو روکے گی۔ باغ کی آواز، جس طرح ہم کو بتاتی ہے اسی طرح ان کو بھی بتائے گی کہ مار ڈالنا نہیں چاہیئے۔

سانپ باغ کی آواز، تمہاری اپنی آواز ہے۔

آدم ہے بھی اور نہیں بھی وہ مجھ سے بڑی ہے میں اس کا ایک جز ہوں۔

حوّا باغ کی "آواز" مجھے تو تم کو مار ڈالنے سے نہیں روکتی، تاہم میں یہ نہیں چاہتی کہ تم مجھ سے پہلے مرو۔ اس احساس کے لئے مجھکو کسی آواز کی ضرورت نہیں۔

آدم (اس کی گردن میں باہیں ڈالکر اور متاثر ہوکر) نہیں نہیں بغیر کسی آواز کے بھی یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے۔ کوئی نہ کوئی ایسی چیز ہے جو ہم کو ایک دوسرے سے وابستہ کئے ہوئے ہے۔ جس کے لئے کوئی لفظ نہیں ہے۔

سانپ محبت۔ محبت۔ محبت۔

آدم یہ تو ایک اتنی بڑی چیز کے لئے بہت چھوٹا سا لفظ ہے۔

سانپ (قہقہہ لگاتا ہے) !!!

حوّا (بے صبری سے سانپ کی طرف مڑکر) پھر وہی دلخراش آواز! اس کو بند کر۔ تو کیوں ایسا کرتا ہے؟

سانپ ممکن ہے عنقریب محبت ایک نہایت چھوٹی چیز کے لئے بہت بڑا لفظ ہوجائے مگر جب تک یہ چھوٹا ہے اس وقت تک بہت شیریں ہوگا

آدم (غور کرتے ہوئے) تو مجھے حیران کر رہا ہے۔ میری پرانی مصیبت اگرچہ بھاری تھی مگر سیدھی سادی تھی۔

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو کا ٹیلیفون نمبر ۱۳۹

جن عجیب و غریب چیزوں کا تو وعدہ کر رہا ہے وہ مجھے موت جیسی نعمت دینے سے پہلے میری ہستی کو الجھا سکتی ہیں۔ میں ابدی زندگی کے بوجھ سے پریشان تھا۔ مگر میرا دل پراگندہ نہیں تھا۔ اگر مجھکو یہ معلوم نہیں تھا کہ میں حوا کی محبت کرتا ہوں تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ممکن ہے وہ میری محبت چھوڑ دے اور کسی دوسرے آدم کی محبت کرنے لگے۔ کیا تو اس علم کے لئے کوئی لفظ بتا سکتا ہے۔؟

سانپ رشک، رشک، رشک!

آدم کیسا بھیانک لفظ ہے!

حوا (آدم کو ہلاتے ہوئے) بہت سوچنا نہیں چاہیئے، تم بہت سوچا کرتے ہو

آدم (غصہ میں) میں سوچنے سے باز کیسے رہ سکتا ہوں، جبکہ مستقبل مشتبہ ہو گیا ہے۔ اشتباہ سے ہر چیز بدتر ہے، زندگی مشتبہ ہو گئی ہے، محبت مشتبہ ہے۔ کیا اس تازہ مصیبت کے لئے تیرے پاس کوئی لفظ ہے؟

سانپ خوف، خوف، خوف۔

آدم اس کا علاج بھی تیرے پاس ہے۔؟

سانپ امید، امید، امید۔

آدم امید کیا ہے؟

سانپ جب تک تم کو مستقبل کا علم نہیں، تم کو یہ علم بھی نہیں کہ مستقبل ماضی سے زیادہ خوشگوار نہیں ہوگا، اسی کو امید کہتے ہیں۔

آدم اس سے مجھے تسکین نہیں ہوتی۔ میرے اندر خوف بہ نسبت امید کے زیادہ قوی ہے مجھے یقین کی ضرورت ہے (دھمکاتا ہوا اٹھتا ہے) یہ چیز مجھے دے ورنہ پھر جب تجھکو سوتا ہوا پاؤنگا تو مار ڈالونگا

حوا (سانپ کے گرد اپنی باہیں ڈال کر) میرا خوبصورت سانپ۔ ارے نہیں یہ خوفناک خیال تمہارے دل میں کیسے آ سکتا ہے۔

آدم خوف مجھ سے ہر کام کرا سکتا ہے، سانپ ہی نے مجھکو خوف دیا اب اس سے کہو کہ مجھکو یقین دے ورنہ میری طرف سے خوف لیکر جائے۔

سانپ مستقبل کو اپنے ارادے سے باندھ لو اور ایک عہد کر لو۔

آدم عہد کیا ہے؟

سانپ اپنی موت کے لئے ایک دن مقرر کر دو۔ اور اس دن مر جانے کا ارادہ کر لو۔ پھر موت مشتبہ نہ رہے گی بلکہ یقینی ہو جائیگی۔ پھر حوا یہ ارادہ کرے کہ وہ تمہارے مرنے تک تم سے محبت کرے گی اس طرح محبت مشتبہ نہیں رہے گی۔

آدم ہاں یہ تو بڑی اچھی بات ہے اس سے مستقبل بندھ جائیگا۔

حوا (ناخوش ہو کر اور سانپ کی طرف سے منہ پھیر کر) لیکن اس سے امید برباد ہو جائے گی۔

آدم (غصہ سے) چپ رہو، امید بری چیز ہے۔ مسرت بری چیز ہے یقین مبارک چیز ہے۔

سانپ "بری" کس کو کہتے ہیں؟ تم نے ایک نیا لفظ نکالا ہے۔

آدم جس چیز سے میں ڈرتا ہوں وہ بری ہے۔ اچھا حوا سنو اور سانپ تو بھی سن۔ تاکہ تم دونوں میرے عہد کو یاد رکھو۔ میں چاروں موسم کے ایک ہزار دور تک زندہ رہونگا۔

سانپ سال، سال۔

آدم میں ایک ہزار سال تک زندہ رہوں گا، اس کے بعد نہیں رہونگا میں مر جاؤنگا اور سکون حاصل کرونگا، اور اس وقت تک حوا کے سوا کسی دوسری عورت کی محبت نہیں کرونگا۔

حوا اور اگر آدم اپنے عہد پر قایم رہے گا تو میں بھی اس کے مرنے تک کسی دوسرے مرد کی محبت نہیں کرونگی۔

سانپ تم دونوں نے نکاح ایجاد کیا ہے آدم تمہارا شوہر ہے جو کسی دوسری عورت کے لئے نہیں ہو سکتا اور تم اس کی بیوی ہو جو کسی دوسرے مرد کے لئے نہیں ہو سکتیں۔

آدم (قدرتاً حوا کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے) شوہر اور بیوی

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر منگائیے۔

حوّا (اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں دبتے ہوئے) بیوی اور شوہر

سانپ (قہقہہ لگاتا ہے) !!!

حوّا (آدم سے اپنے کو علیحدہ کرکے) میں نے کہدیا کہ یہ منحوس شور نکر

آدم اُس کی بات نہ سُن۔ شور مجھے پسند ہے، اس سے میرا دل ہلکا ہوتا ہے، تو بڑا خوش دل سانپ ہے، لیکن تو نے ابھی کوئی عہد نہیں کیا۔ تو کیا عہد کرتا ہے؟

سانپ میں کوئی عہد نہیں کرتا۔ میں اتفاق سے فائدہ اٹھاتا ہوں۔

آدم اتفاق؟ اس کے کیا معنی؟

سانپ اس کے معنی یہ ہیں کہ مجھکو یقین سے اتنا ہی خوف ہے، جتنا تمکو اشتباہ سے، یعنی سوائے اشتباہ کے کوئی چیز یقینی نہیں، اگر میں مستقبل کو باندہ لوں تو اپنے ارادہ کو باندہ لونگا۔ اور جب ارادہ کو باندہ لوں گا، تو پیدائش میں رکاوٹ شروع ہوجائگی۔

حوّا پیدائش میں رکاوٹ نہیں ہونی چاہیئے، میں نے کہدیا کہ میں پیدا کرونگی۔ اگر ایسا کرنے میں مجھے اپنے کو پرزے پرزے بھی کردینا پڑے

آدم تم دونوں چپ رہو میں مستقبل کو ضرور باندہونگا۔ میں خوف سے ضرور آزاد ہونگا۔ (حوّا سے) ہم اپنا اپنا عہد کر چکے، اگر تم کو پیدا کرنا ہے تو تم اس عہد کے حدود کے اندر پیدا کرو۔ اب زیادہ سانپ کی باتیں نہ سنو (حوّا کا بال پکڑ کر کھینچتا ہے)

حوّا چھوڑ احمق! ابھی اس نے مجھکو اپنا راز نہیں بتایا ہے۔

آدم (اس کو چھوڑ کر) ہاں ٹھیک ہے، احمق کس کو کہتے ہیں؟

حوّا میں نہیں جانتی یہ لفظ آپ سے آپ آگیا۔ جب تم بھول جاتے ہو! اور سوچنے لگتے ہو اور خوف سے مغلوب ہوجاتے ہو۔ اس وقت تم جو کچھ ہوتے ہو وہی احمق ہے۔ آؤ سانپ کی باتیں سنیں!

آدم نہیں مجھے خوف معلوم ہوتا ہے جب وہ بولتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین میرے پاؤں کے تلے بیٹھ رہی ہے۔ کیا تم اُس کی باتیں سننے کے لئے ٹہیرو گی؟

سانپ (قہقہہ لگاتا ہے) !!!

آدم (شگفتہ ہوکر) اس آواز سے خوف دور ہوجاتا ہے، کیا تماشا ہے سانپ اور عورت آپس میں راز کی باتیں کرنے جارہے ہیں۔ (ہنستا ہے اور آہستہ آہستہ چلا جاتا ہے یہ اس کی پہلی ہنسی تھی)

حوّا اب راز بتا راز! (چٹان پر بیٹھ جاتی ہے اور سانپ کے گلے میں باہیں ڈالدیتی ہے سانپ زیر لب کچھ کہنا شروع کرتا ہے) حوّا کا چہرہ انتہائی دلچسپی سے چمکنے لگتا ہے، اُس کی دلچسپی بڑہتی جاتی ہے یہاں تک کہ پھر اس کی جگہ انتہائی نفرت کی علامتیں نمودار ہوجاتی ہیں اور وہ اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں سے چھپا لیتی ہے۔

باقی ——— باقی

مجنوں گورکھپوری

اگر علیحدہ علیحدہ یا سب بذریعۂ وی پی یہ کتابیں منگائی جائینگی، تو علاوہ محصول معہ میں روانہ کی جائنگی لیکن اگر آپ صرف

تصنیفات مولینا نیاز فتحپوری

نگارستان عا

صحابیات عہ

گہوارۂ تمدن عا

شہاب کی سرگذشت عہ

چھ روپیہ بذریعۂ منی آرڈر پہلے روانہ کردینگے تو یہ کتابیں مع محصول آپ کو چھ روپیہ میں ہی بھیجدی جائیں گی

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر ملتا ہے جلد منگایئے

اورنگ آباد اور اس کا نواح

اورنگ آباد، تعلقہ، ضلع، اور صوبہ، کا مستقر ہے این جی ایس ریلوے (چھوٹی لین) پر واقع ہے خطوط ۱۹° ۳۱' شمالی و ۷۵° ۲۰' شرقی کے تقاطع پر کوم (خام) ندی کے کنارہ پر آباد ہے۔ بلحاظ وقعت تاریخی اور وسعت سلطنت آصفیہ کا دوسرا شہر ہے، سنہ ۱۶۱۰ء میں ملک عنبر وزیر سلطنت نظام شاہیہ احمد نگر نے اس شہر کی بنا موضع کھڑکی کے قریب ڈالکر اسکو "فتح نگر" سے موسوم کیا، سترہویں صدی کی ابتدا میں نظام شاہی فوج بہ ماتحتی ملک عنبر مغلوں سے لڑتی رہی سنہ ۱۶۲۶ء میں ملک عنبر کا انتقال ہوگیا اور نظام شاہی قوت گھٹنے لگی حتی کہ سنہ ۱۶۳۴ء میں ممالک محروسۂ نظام شاہی ضمیمہ سلطنت دہلی قرار پایا سنہ ۱۶۳۵ء میں صوبہ داری دکن پر اورنگ زیب کا تقرر ہوا، اور کلو ر سنہ ۱۶۵۳ء صوبہ دار ہوئے کھڑکی میں قیام کے وقت اس کا نام بدل کر اورنگ آباد سے موسوم کیا، اورنگ زیب نے یہیں بیٹھ کر مرہٹوں، شاہان گولکنڈہ وغیرہ سے چھیڑ چھاڑ شروع کی، سنہ ۱۶۵۸ء میں شاہجہاں کو تخت سے اتار کر دکن کا رخ کیا اور مرہٹوں سے لڑائی شروع کی سنہ ۱۷۰۷ء میں احمد نگر میں انتقال کیا اور طوائف الملوکی شروع ہوئی، اسی زمانہ میں نظام الملک آصف جاہ بہادر اول نے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اور صوبجات دکن پر قابض ہوکر حیدر آباد کو پایہ تخت قرار دیا۔

شہر اورنگ آباد کے شمال و جنوب کو بیل اور ساتنا پہاڑوں کے سلسلہ نے محدود کردیا ہے، کہتے ہیں کہ اس کی مردم شماری دو لاکھ نفوس ہوگئی اور موجودہ ویرانوں اور کھنڈروں سے آبادی کی شہادت ملتی ہے جدید شہر پرانے اورنگ آباد کے مشرق میں واقع ہے، اور چھاؤنی مغرب کی طرف ندی کے اس پار ہے سنہ ۱۸۵۳ء میں کنٹن جنٹ اور عربوں میں ایک مختصر سی جھڑپ ہوگئی سنہ ۱۸۵۷ء میں بھی ایسا ہی ارادہ تھا، مگر کامیابی نہ ہوئی۔

اورنگ آباد کی سطح آراضی نہایت ہی ناہموار ہے، آبادی مستطیل ہے، آبادی کا طول ۲½ اور عرض ۱½ میل ہے اور دور (۸) میل ہے شہر پناہ نہایت ہی مضبوط اور سنگ بستہ ہے جابجا مورچے، بروج بنے ہوئے ہیں فصیل کی بلندی (۱۴) فٹ اور بعض جگہ اس سے زیادہ ہے۔ فصیل میں تفنگ اندازی کے جھروکے بنے ہوئے ہیں اور توپیں بھی چڑھی ہوئی ہیں..... چار بڑے دروازے (جالنہ دروازہ، پٹن دروازہ، مکہ یا مکائی دروازہ، دہلی دروازہ،) ہیں اور بعض دروازے کھلے یا بند موجود ہیں، اس طرح تیرہ دروازے اور متعدد کھڑکیاں ہیں اطراف میں ۵۴ محلے آباد تھے جن میں سے اب صرف بیگم پورہ میں بعض مکانات نظر آتے ہیں باقی کھنڈر ہیں؛

ایک زمانہ میں ۴۸ بازار تھے مگر اب ۷ - ۱۰ کے نام سنے جاتے ہیں اب صرف چوک اور شاہ گنج ذرا دلچسپ ہیں اور بقیہ خشت ذدہ تمام شہر ویران پڑا ہے، جدہر دیکھو..... کھنڈر ہی کھنڈر نظر آتے ہیں قدیم مکانات نہایت ہی وسیع کشادہ مضبوط اور مستحکم ہیں ہر مکان میں حوض اور نہریں موجود ہیں مکانات کئی کئی منزلہ اور خوش وضع ہیں۔

مسجد شاہ گنج	یہ مسجد اورنگ آباد کے آباد اور پر رونق بازار شاہ گنج میں واقع ہے اور بہترین مسجد مانی جاتی ہے سنہ ۱۷۲۰ء میں تیار ہوئی ہے سید حسن علی خاں صوبہ دار دکن نے سنہ ۱۷۱۹ء میں اس مسجد کا حوض بنوایا، نواب عقدالدولہ نے مسجد کی متعلقہ عمارت بنوائی

ہر عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگائیے

مسجد کی کرسی نہایت ہی بلند اور شاندار ہے، تین طرف دو کانیں بنی ہوئی ہیں سامنے سیڑھیاں ہیں، مسجد کے پانچ در اور ۴۴ ستون ہیں، درمیانی گنبد بلند اور عمدہ ہے مشرق و مغرب میں مسافروں کے قیام کے لئے وسیع دالان بنے ہوئے ہیں مسجد میں گل کاری کی گئی ہے جو بہترین ہے مسافروں کے ٹھہرنے کے دالان عام خاص کہلاتے ہیں مسجد کی چھت پر چھوٹے چھوٹے لداؤ گنبد ہیں، دونو جانب دو بلند اور دروازے پر چھوٹے چھوٹے مینار ہیں بیچ میں گھڑیال نصب ہے۔

مسجد چوک یہ مسجد بھی اورنگ آباد کے وسیع اور دلکشا بازار چوک میں واقع ہے اسے اورنگ زیب کے چچا شائستہ خاں نے سنہ ۱۰۷۶ھ میں بنوایا تھا۔ بیرونی رخ پر پانچ اور اندر دو مینار ہیں آٹھ ستون سنگین ہیں چھت پر پانچ گنبد ہیں جن میں بیچ کا گنبد بڑا ہے۔ جس پر کلس بھی چڑھا ہوا ہے، دونو جانب بڑے بڑے مینار ہیں صحن میں حوض ہے دروازہ شاندار ہے جس پر چھوٹے چھوٹے دو مینار بھی ہیں نیچے ایک طرف دو کانیں ہیں اور دروازہ کے دونوں بازو دو حجرے مسافروں کے ٹھہرنے کے لئے تھے مگر موذن کی بدمزاجی سے بہت ہی کم مسافر ٹھہرتے ہیں، اندرون مسجد ۴۴ شعر دیوار پر کندہ ہیں یہ کتبہ میرزا محمدؐ ابن محمد شریف یمنی کا منظوم کردہ ہے ؎

مسجد از لطف الٰہی شد تمام

میں تاریخ تعمیر ۱۰۷۶ھ نکالی ہے۔ بیرون مسجد انہیں یمنی بزرگوار کے ۱۱ شعر کندہ ہیں ؎

بہیں دلکشا جائے حاجت روائی

میں تاریخ سنہ ۱۰۸۵ھ نکالی ہے، یمنی صاحب کے شعر بھی ایسے ہی ہیں جیسا کہ مادہ تاریخ جائے حاجت روائی کی جدت ملاحظہ ہو یہ مسجد کی تاریخ ہے کتبوں کا خط بہت بھدا اور پتھر معمولی ہے دروازہ پر ایک شعر اسی خط میں معمولی پتھر پر کندہ ہے ؎

مسجد شائستۂ شائستہ خاں

ساخت بیک سال محمدؐ شریف

اسی مسجد میں نواب سعادت جنگ بہادر صدر ناظم مال سمت مراہٹواڑی (صوبہ دار اورنگ آباد) نے مدرسہ حفاظ قائم فرمایا ہے۔ جس میں بارہ پندرہ لڑکے کلام مجید حفظ کرتے ہیں۔

مسجد عالمگیری یہ مسجد حاجی قاسم کی مسجد کہلاتی ہے انگوری باغ کے پاس ایک مختصر سی مسجد ہے۔ جسے سنہ ۱۰۹۶ھ میں عالمگیر نے بنوایا تھا ایک کتبہ بھی نصب ہے جس سے سن تعمیر کا پتہ چلتا ہے۔

کالی مسجد ملک عنبر نے سنگ سیاہ کی سات مسجدیں بنوائی تھیں جو کالی مسجد کہلاتی ہیں منجملہ ان کے ایک جونا بازار کی کالی مسجد ہے جو سنہ ۱۰۲۸ھ میں تعمیر ہوئی ہے جو ایک بلند چبوترے پر واقع ہے اور پانچ دری ہے۔

جامع مسجد یہ بہترین اور عمدہ مسجد ہے اس میں پانچ قطاروں میں چالیس ستون ہیں جو مسجد کو ۲۷ قطعات میں تقسیم کرتے ہیں، ہر ایک پر برجیاں بنی ہوئی ہیں، یہ مسجد ملک عنبر نے بنوائی تھی، مگر اورنگ زیب نے سنہ ۱۶۱۲ء میں مکمل کرایا، کرسی بلند ہے جس کے نیچے بریکٹ لگے ہوئے ہیں، پردے کی دیوار مشبک ہے وضع قطع نہایت ہی عمدہ ہے اور بہت اچھی حالت میں ہے، سامنے وسیع صحن

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کا تار کا پتہ صرف خاکانی ہے

تین حجرے مسافروں کے لئے ہیں وسط صحن میں حوض ہے۔

لال مسجد یہ مسجد عہد اورنگ زیب میں مفتی زین العابدین نے ۱۰۶۵ء میں بنوائی ہے، تمام مسجد میں سرخ پتھر استعمال کیا گیا ہے۔ استرکاری بہترین اور عمدہ ہے۔

درگاہ شاہ مسافر محمود دروازہ کے پاس آپ کی درگاہ باغ کے اندر واقع ہے۔ اورنگ زیب آپ کا بہت معتقد تھا، آپ نے ۱۱۲۶ء میں انتقال کیا، ایک مدرسہ، مسجد، کچہری، ایوان، سرائے، اور چند عمارات درگاہ ہی کے متعلق ہیں ان عمارات میں سنگ سرخ کا استعمال کیا گیا ہے، تمام ستون سنگ سرخ کے ہیں شاہ صاحب کا مزار بھی سنگ سرخ کا ہے کئی ایک پختہ حوض اور فوارے ہیں، باہر ایک بڑا حوض ہے جس میں نہر کا پانی آتا ہے جو بہت بلندی سے چادر کی طرح حوض میں گرتا ہے اور اسی پانی کی ایک نالی سیدھی جانب گر کر پن چکی بھی حرکت دیتی ہے، اب تو پن چکی ٹوٹ گئی ہے۔ اس درگاہ کی ترمیم جین قلیچ خاں کے کسی ہمراہی امیر نے کی تھی۔ پنچکی کے پاس کا بڑا حوض ۱۱۹۵ء کے بعد بنا ہے، اورنگ آباد میں یہی ایک پرفضا جگہ ہے اندر ایک مسجد بھی بہترین اور عمدہ ہے جس کے پیچھے درگاہ ہے، سامنے نبی خانہ وغیرہ ہے جہاں ایک " درہ " رکھا ہوا ہے یہ درہ سیلا پے کی وضع کا چمڑہ کا ٹکڑا ہے جس میں لکڑی کا دستہ لگا ہوا ہے یہی وہ شرعی درہ ہے جس نے عالمگیر کا نام اب تک روز روشن کی طرح مشہور کر رکھا ہے۔

پنچکی سے تھوڑے فاصلہ پر لب سڑک خان بہادر مبارک علیخاں مرحوم مہتمم کوتوالی سرکار عالی اور ان کی صاحبزادی ایک چوکھنڈی میں مدفون ہیں۔ جن کے پہلو میں نور محمد صاحب دوم تعلقہ دار کا مزار ہے، یہ درگاہ پن چکی کی درگاہ کے نام سے مشہور ہے۔ سنا ہے کہ درگاہ کے متعلق ایک عظیم الشان کتب خانہ بھی تھا جو ضایع ہو گیا؛

بارہ دری دہلی دروازہ سے متصل دمڑی محل اور بارہ دری واقع ہے یہ بارہ دری عقد الدولہ کی بنائی ہوئی ہے۔ جس میں اب سرکاری دفاتر ہیں اس کے متعلق ایک باغ بھی ہے جس میں متعدد حوض اور فوارے وغیرہ ہیں۔

دمڑی محل بارہ دری کی تیاری کے وقت مزدوروں سے فی مزدور ایک ایک دمڑی لے کر جمع کی گئی اور اس سے یہ محل بنایا گیا ہے، یہ ایک چھوٹا سا پانچ درہ مکان ہے۔

آئینہ خانہ یہ ایک وسیع مکان ہے جس میں اس وقت دفتر ہے۔

محل نوکھنڈہ یہ محل ایک بلند ٹیکری پر واقع ہے جسے ملک عنبر نے ۱۶۱۶ء میں بنوایا تھا ہٹر کل کا مشہور دروازہ اس محل کا صدر دروازہ ہے ملک عنبر کے زمانہ میں دروازہ ہٹر کل نقار خانہ کا کام دیتا تھا۔

محل نوکھنڈہ کی عمارت میں بہت سی تبدیلیاں ہو گئی ہیں عالم علی خاں نے اس میں بہت کچھ اضافہ کیا اور آصف جاہ بہادر نے بھی اس میں توسیع کی ان کے بعد ناصر جنگ بہادر نے اکثر عمارات وغیرہ بنوائیں، اور نواب نظام علی خاں بہادر نے جبکہ وہ اس میں تشریف رکھتے تھے بہت ساری تبدیلیاں کیں یہ کہنا مشکل ہے کہ کونسی عمارت کس نے بنائی۔

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو کا عطر مقبول عام ہے

اس میں پانچ زنانے محلات، دیوان عام، دیوان خاص، مسجد وغیرہ ہیں ہر ایک کے آگے خانہ باغ اور اس میں متعدد حوض ہیں، دیوان خانہ اور حمام بھی علیحدہ ہیں، دیوان عام کے سامنے ایک کچہری ہے جس میں مسند حضور بندگان عالی رکھی ہوئی ہے، جو عیدین میں بچھائی جاتی ہے اور شاہانہ تزک و احتشام سے عہدہ داران مستقر مسند کے سامنے نذر پیش کرتے ہیں۔

درگاہ نوکھنڈے کے پاس ہی سید شاہ تاج الدین حموی (المتوفی سنہ ۱۱۱۰ھ) اور سید شاہ سلیمان بغدادی (المتوفی سنہ ۱۱۵۶ھ) سید شاہ عزیز بادشاہ (المتوفی سنہ ۱۲۰۹ھ) جین بیگم صاحبہ بنت نواب آصف جاہ (المتوفیہ سنہ ۱۱۶۲ھ) کے مزار ہیں۔

گنبد پیر اسمٰعیل ہرسول کی سڑک پر دہلی دروازہ کے باہر عالمگیر کے استاد پیر اسمٰعیل صاحب کا گنبد اور باغ ہے۔ باغ کا دروازہ عمدہ اور شاندار ہے۔ جس کا محراب اونچا اور ڈیوڑھی نما ہے، دیواروں پر نقش و نگار ہیں، کونوں پر برج بنے ہوئے ہیں۔

قلعۂ آرک اورنگ زیب نے سنہ ۱۶۹۲ء میں قلعۂ آرک بنوایا اس کے پانچ دروازے ایک نقار خانہ ہے ان عمارات کی ترمیم ہوتی رہتی ہے کیونکہ حضور نظام جب کبھی تشریف لاتے ہیں یہیں تشریف رکھتے ہیں معزز مہمان بھی یہیں پر ٹھہرتے ہیں۔ اس میں ایک دربار ہال کئی ایک عمارات باغ وغیرہ موجود ہیں فرنیچر نہایت ہی عمدہ اور بہترین ہے گویا اورنگ آباد کا گورنمنٹ ہاؤس ہے۔

سرائے موضع ہرسول میں اورنگ زیب نے تین سرائے بنوائی تھیں جن میں سے ایک سرائے بہت بڑی اور عمدہ ہے جس میں مجلس تھا جو تخفیف ہو گیا۔

سنہری محل سنگ پورے کے پہاڑ پر واقع ہے اس کو ایک بندیلے افسر نے عہد عالمگیر بنوایا تھا، یہ عمارت بلند کرسی پر ہے، چونکہ اسکے اندر بعض جگہ طلائی نقش و نگار تھے اس لئے سنہری محل نام مشہور ہو گیا۔ یار لوگوں نے سب نکال لیا۔ اب محل ویران ہے اب اس میں گھانس بھری ہوئی ہے۔

چھپیا خانہ یہ پنڈت خانہ بھی کہلاتا ہے۔ ملک عنبر نے پنڈتوں کے لئے بنوایا تھا، مگر اورنگ زیب نے مسافر خانہ بنا دیا اور پھر جیلخانہ بن گیا اب اس میں سرکاری دفتر ہے۔

مقبرۂ رابعہ دورانی شہزادہ اعظم شاہ نے اپنی والدہ دلرس بانو رابعہ دورانی محل اورنگ زیب المتوفیہ سنہ ۱۶۵۷ء کی مزار پر یہ مقبرہ بنوایا ہے اس کی تعمیر سنہ ۱۶۵۱ء میں شروع اور سنہ ۱۶۶۱ء میں ختم ہوئی یہ مقبرہ عطاء اللہ کی نگرانی میں بنا ہے، جس کا صرفہ ۶ لاکھ اڈسٹھ ہزار دو سو تین روپیہ بیان کیا جاتا ہے۔ یہ تاج محل کی نقل ہے مگر افسوس ہے کہ اصل سے مناسبت نہیں رکھتا مقبرہ کا احاطہ ۵۰۰ × ۳۰۰ گز ہے اس کی دیوار پختہ اور فصیل نما ہے باہر کی طرف اس میں محراب بھی بنے ہوئے ہیں اکثر جگہ برج اور مینار بھی ہیں، جنوبی دیوار کے بیچوں بیچ ایک خوبصورت دروازہ ہے جن پر پتیل چڑھا ہوا ہے اور بہترین نقش و نگار سے مزین ہے ہر سہ جانب عظیم الشان بارہ دریاں ہیں جن کے سامنے سے مقبرہ کو سڑک گئی ہے، مقبرہ کی عمارت مثمن شکل کی ہے، ہر زاویہ پر مینار ہیں سامنے ایک محراب ہے اور آنے کے لئے ایک دروازہ ہے محراب کے دونو بازو کمانیں ہیں، جن میں سے گیلری کو راستہ جاتا ہے، مقبرہ کا چبوترہ ۷۲ فٹ مربع سنگ سرخ کا ہے۔ چاروں طرف ۷۲ فٹ بلند مینار ہیں ہر مینار کے نصف حصے پر گیلری ہے اور اوپر ایک گیلری اور برجیاں ہیں جن پر کلس چڑھے ہوئے ہیں

ہر قسم کے عطر کے لئے اصغر علی محمد علی کو لکھیئے۔

یہ مینار ثمن ہیں، اور اوپر چڑہنے کے لئے گول چکردار سیڑہیاں بنی ہوئی ہیں۔

مقبرہ ایک سنگ مرمر کی بہترین گنبد ہے جس کے چاروں طرف چار محراب اور چار مینار ہیں مقبرے کے اندر جانے کے لئے چبوترے پر سے سیڑہیاں ہیں جو نیچے پہنچاتی ہیں بیچ میں مزار ہے جس پر سنگ مرمر کی جالی ہے اندر محرابوں اور ستونوں پر بے نظیر گلکاری کی گئی ہے، جابجا سنگ مرمر کی جالیاں نصب ہیں جن پر پچی کاری کی گئی ہے، فرش سنگ مرمر کا ہے بعض جگہ اینٹ اور چونہ بھی استعمال کیا گیا ہے اور استرکاری بہترین موتی کے چونے سے کی گئی ہے۔ فرش پر گلکاری ہے۔

چبوترے کے مغرب میں ایک مسجد ہے جس کے پانچ در ہیں اور اندر متعدد ستون مسجد کے دونوں طرف جالیاں ہیں رو کار پر بہترین نقش و نگار ہے فرش چونہ کا ہے مگر بہترین چکنا اور چمکدار اور نہایت ہی سفید ہے۔ فرش پر سیاہ مسالہ کی جا نماز کے نشانات ہیں جو دور سے سنگ مرمر پر سنگ موسیٰ کی پچی کاری نظر آتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مقبرہ کے لئے جو سنگ مرمر استعمال ہوا ہے وہ جیپور کا ہے۔

اعظم باغ مقبرہ کے متصل اعظم شاہ کا ایک ویران باغ ہے جو اعظم باغ کہلاتا تھا، مگر اب وہ انجمن ترقی اردو کے قبضہ میں ہے، اور "اردو باغ" کے نام سے موسوم ہے اس میں ایک افتادہ مکان ہے جس میں انجمن کا پریس وغیرہ ہے، اس کے قریب ایک مکان میں مولینا عبدالحق معتمد انجمن ترقی اردو رہتے ہیں۔

چھتری موضع ہرسول میں اورنگ زیب کے مشہور افسر فوج راجہ جے سنگ کی بنائی ہوئی چھتری ہے۔ یہ ایک چھتری کی وضع کی بنائی ہوئی عمارت ہے، جس پر مثمن شکل کا گنبد ہے اور ایک اٹھائیس ستونوں کا برآمدہ، جس کے اوپر ہشت پہلو برجیاں بنی ہوئی ہیں یہ راجپوتوں کا مدفن ہے۔

پھلمری اورنگ آباد سے سولہ میل کے فاصلہ پر ایک بڑا قصبہ ہے جس کے وسط میں ایک مضبوط گڑہی اور مندر وغیرہ ہیں گڑہی تو خیر باقی ہے مگر مندروں کے پتھر مسلمانوں کے کام آئے ایک دیول پر سنسکرت کتبہ ہے جس سے سنہ تعمیر سنہ ۱۲۲۴ء معلوم ہوتا ہے۔

ستارا اورنگ آباد سے جانب جنوب تین میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا قصبہ آباد ہے اس کی ایک گڑہی اب بالکل افتادہ اور ویران پڑی ہوئی ہے اس میں ایک بڑا مندر ہے جس کی جاترا بڑے دہوم سے ہوتی ہے اور اسی وجہ سے یہ قصبہ مشہور بھی ہے۔

مزارِ سراج سراج اورنگ آباد کے مشہور شاعر گزرے ہیں آپ اورنگ آباد ہی کے باشندے اور صاحب دل شاعر تھے آپ کا مزار قلعہ ارک کے قریب کس مپرسی کے عالم میں پڑا ہوا ہے آپ کا دیوان انجمن ترقی اردو کی طرف سے شایع ہونیوالا ہے۔

ذرائع آب اورنگ آباد میں پانی کا بہت آرام ہے ہر چھوٹے بڑے مکان میں حوض موجود ہے جن میں نہر آتی ہے اور ہر مسجد یا چوراہے پر نل ہے۔ اور پانی بہ افراط میسر ہوتا ہے۔ یہ نہریں پہاڑوں پر سے لائی گئی ہیں، مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ مخزن الماء کہاں سے بنایا گیا ہے، کیونکہ اونچے سے اونچے مقام پر بھی نہر کا پانی پہنچتا ہے، کل ذخیرۂ آب چودہ ہیں مگر ان کے مخزن نامعلوم ہیں، نہر بعض جگہ پختہ اینٹوں کی بنی ہوئی ہے، اور بعض جگہ گچ کے گول نل بنے ہوئے ہیں بعض بعض جگہ انہیں نلوں پر مینار نما بنا دیے گئے ہیں جو ہوا پہنچا کر پانی کو صاف رکھنے کے علاوہ روانی آب میں بھی معاون ہوتے ہیں۔

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کے عطر خریدنا چاہئیں

غارہائے اورنگ آباد

اورنگ آباد سے ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر جانب شمال ڈیڑھ میل تک ایک غاروں کا سلسلہ چلا گیا ہے، اُس میں تین گروپ اور بارہ غار ہیں، پہلا گروپ بدھ کے زمانہ کا ہے اور دوسرا گروپ بھی اُسی کے ساتھ کا، مگر تیسرا گروپ اُس سے قدیم اور ناتمام ہے۔ پہلے گروپ میں پانچ غار ۳۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہیں۔

غار نمبر ۱۔ مغرب کی طرف سے دیکھنے لگیں تو پہلا غار ۴۰ فٹ لمبا ملیگا اس کے آگے چار ستون کا برآمدہ ہے، جس کا طول (۵۰) فٹ اور عرض (۹) فٹ ہے، طرزِ عمارت اجنٹا کے غار نمبر ۱ سے ملتی ہوئی ہے، برآمدے کے پیچھے دیواریں اور تین دروازے دو جھروکے ہیں، وسطی دروازہ پر گلکاری کی گئی ہے اور چوکھٹ پر زنانے اور مردانے مجسمے ہیں، کھڑکیاں بھی نقش و نگار سے پُر ہیں، مغرب میں بدھ کنول کے پھول پر بیٹھا ہے جس کے دونوں طرف آدمی چور چھل لئے کھڑے ہیں، کنول کو پانچ ناگ پھنوں پر اُٹھائے ہوئے ہیں، مغربی سمت میں برہمنوں کی ایک قطار ہے۔

غار نمبر ۲۔ اس کے سامنے کا حصّہ گرا ہوا ہے، ایک برآمدہ دو ستونوں پر قایم ہے، اندرونی حصہ ۲۱ × ۹ فٹ ہے اور اُس کے اطراف چار فٹ چوڑا پراوکشنا ہے۔ رد کار کا مندر ۱۴ فٹ بلند ہے جس کے دونوں بازوؤں پر دو دواریال کنول کے پھول پر کھڑے ہیں ان کے ساتھ دو دیا دھر اور پانچ پھن کے ناگ ہیں، بائیں طرف پدمنی کی مورت معمولی لباس میں ہے جس کی پیشانی پر بدھ کی تصویر ایک ہاتھ میں کنول کی چھڑی لئے ہے، دوسرے مجسمہ کی نسبت خیال ہے کہ اندر کا ہوگا، اندر بودھ کی ۹ فٹ اونچی مورت ہے جو کنول کے پھول پر بیٹھی ہے، کندھوں پر دو آدمی کھڑے ہیں۔ یہ تصاویر ایک زمانہ میں رنگین ہوں گی، کیونکہ اب بھی ان پر رنگ کے علامات موجود ہیں۔

غار نمبر ۳ یہ دیہارا غار ہے ابتدائی برآمدہ ۳۰ فٹ۔ ۶ × ۸ فٹ۔ ۹ ہے اس کے چار ستون ہیں اور دو حجرے پچھلی دیوار میں ایک دروازہ اور دو دریچے ہیں ایک ہال ۴۱ فٹ ۶ × ۴۲ فٹ ۶ کا ہے اس کے بارہ ستون ہیں جن پر بہترین نقش و نگار ہیں ایک حجرہ سادہ ہے اور دوسرے میں کام کیا گیا ہے۔ چاروں کونوں میں چار حجرے پجاریوں کے لئے بنے ہیں، اندرونی مندر کے ستون نقشی ہیں دیوار پر دو عورتوں کی تصویریں ہیں، جو ایک درخت کے سایہ میں کھڑی ہیں مندر میں داخل ہونے کے لئے سیڑھیاں ترشی ہوئی ہیں دروازہ بھی منقش ہے۔ دونوں طرف ایک ایک مورت ہے جس کے سر پر ناگ کا پھن سایہ فگن ہے مندر میں بدھ کا ایک بڑا مجسمہ ہے اور سامنے دو قطاروں میں مرد اور عورتیں مل کر کھڑی ہوئی ہیں یہ غار ۸۲ فٹ گہرا ہے اور تریسٹھ فٹ چوڑا ایک طرف جنگ کا مرقع بہترین طریقہ پر دکھایا گیا ہے ایک جانب بدھ پلنگ پر لیٹا نظر آتا ہے۔

غار نمبر ۴۔ یہ ایک چیتا قسم کا منہدمہ غار ہے سامنے کا حصہ بالکل ٹوٹ گیا ہے ۳۸ فٹ × ۲۲ فٹ طول و عرض ہے چھت سادہ اور ستره معمولی ستون ہیں۔ مندر کا حجرہ ۲۳ × ۱۲ فٹ ہے۔

غار نمبر ۵۔ اس کا بھی زیادہ حصہ گر گیا ہے صرف ایک مندر اور پراوکشنا کی دیواریں باقی ہیں۔ اس میں بدھ شیر کے تخت پر بیٹھا ہوا ہے اس کا نام پارس ناتھ ہے اور غالباً جینیوں کا زمانہ ہے۔ یہاں پہلا گروپ ختم ہوتا ہے۔

غار نمبر ۶۔ یہ غار دوسرے گروپ میں ہے جو پہلے گروپ سے تقریباً ایک میل کے فاصلہ پر ہے، یہ ایک دیہارا قسم کا غار ہے مگر بعض باتیں چیتائے کی سی بھی پائی جاتی ہیں۔ بیچ میں مندر اور اطراف میں حجرے ہیں ایک برآمدہ ۳۸-۱ × ۹ فٹ کا ہے جس کے ستون منہدم ہو چکے ہیں عقبی حصے میں دو کمرے ہیں جن میں مردوں اور عورتوں کی تصاویر ہیں، مندر میں بدھ کی طویل اور عظیم الشان مورت ہے اور مندر کی دیواریں

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو کا ہر عطر نہایت نفیس ہے

اور چھتیں رنگین ہیں یہ بھی اجنٹا کے غاروں کی طرز کا عمدہ غار ہے۔

غار نمبر ۷ - ابتدائی برآمدہ شکستہ ہے البتہ چار ستون منقش قایم ہیں ایک ہال ۳۴ × ۱۴ فٹ کا ہے جس کے دو مربع ستون عمدہ تراش کے ہیں اندر ایک ہال ۳۸ × ۳۰ فٹ کا ہے اور اس کے اندر ۱۰ فٹ مربع مندر ہے مندر کے اطراف پراد کشنا ہے برآمدہ کے دونوں طرف دو حجرے ہیں جن میں کئی کئی مورتیں ہیں ان کے علاوہ چھ حجرے سناسیوں کے لئے رہنے کو ہیں - اس کی بعض دیواروں پر بہترین مرقع بنے ہوئے ہیں خصوصاً یہ منظر کہ موت کی دیوی ایک ماں کی گود سے بچے کو چھینے رہی ہے بہ غایت دردناک ہے، ایسا ہی منظر ایلورا اور اجنٹا کے غاروں میں بھی ہے - ان تمام غاروں میں بھی ایک بہترین غار ہے؛

غار نمبر ۸ - یہ ایک غیر مکمل غار ہے جو شروع کرکے چھوڑ دیا گیا ہے - صرف ایک ہال ۲۷ × ۲۰ فٹ تراشا گیا ہے جس میں بہترین نقاشی صرف کی گئی اگر یہ غار تکمیل کو پہنچتا تو یقیناً سب غاروں سے عمدہ اور بہترین ہوتا۔

غار نمبر ۹ - یہ بھی عمدہ غار ہے، مگر بالکل شکستہ ابتدائی ہال ۸۵ × ۱۹ فٹ ہے اس کے پیچھے دوسرا ہال ۱۵ × ۱۳ فٹ ہے اور اس کے عقب میں تیسرا ہال ۳۸ × ۱۳ فٹ اور اس کے بعد ایک اور چوتھا ہال ۱۴ × ۱۴ فٹ ہے دوسرے ہال میں صرف بدھ کی مورت بیٹھی ہوئی ہے - تیسرے میں دیواروں پر زنانہ مورتیں ہیں - چوتھے ہال میں بدھ ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہوا ہے دیواروں پر ان گنت مورتیں ہیں ایک دیوار پر بدھ کی ۱۲ فٹ اونچی مورت بھی بیٹھی ہوئی ہے۔

غار نمبر ۱۰ - یہ تیسرے گروپ کا پہلا غار ہے جو بہت معمولی ہے۔

غار نمبر ۱۱ یہ بھی غار نمبر ۱۰ کی طرح معمولی غار ہے کوئی بات قابل ذکر نہیں ہے۔

غار نمبر ۱۲ - یہ غار گذشتہ دو غاروں کے نسبتاً کسی قدر اچھا ہے، مگر نامکمل ہے - صرف اس کا برآمدہ مکمل حالت میں ہے جو ۴۵ فٹ مربع ہے اسکے بعد کوئی چیز نہیں ہے یہ بالکل آخری غار ہے۔

دکن کی پہاڑی تراشیدہ منادر میں ان کو دوسرا درجہ دیا جاسکتا ہے - کیونکہ اجنٹا کو اول اور ایلورا کو دوم درجہ پر رکھیں تو ان کے بعد انہیں کا نمبر ہے به لحاظ صنعت و کاریگری بھی یہ غار اسی کے مستحق ہیں۔

ماخذ

گزیٹر ممالک محروسہ سرکار عالی مرتبۂ سر ولیم ہنٹر؛
گزیٹر ممالک محروسہ سرکار عالی مرتبہ مولوی میرزا مہدی علیخاں؛
واقعات مملکت بیجاپور جلد سوم مولفۂ مولوی بشیر الدین احمد؛
تاریخ بیجانگر مولفۂ مولوی بشیر الدین احمد؛
تاریخ دکن سلسلۂ آصفیہ مولفۂ مولوی سید علی بلگرامی؛
نیو امپیریل سریز آف آرکیولاجیکل سروے مرتبہ مسٹر ہنری گزنس؛
رپورٹ سررشتہ آثار قدیمہ سرکار عالی مرتبہ مولوی غلام یزدانی؛

تمکین کاظمی

حالی اور نثر اردو

ناصح مشفق ہیں یاروں کے نہ مصلح اور مشیر — درد مندانِ کے نہ ان کے درد کے درماں ہیں ہم
پھوٹ پڑتے ہیں تماشہ اس چمن کا دیکھکر — نالۂ بے اختیارِ بلبل نالاں ہیں ہم

حالی کی حیات پڑھنے والے کے لئے بہت کم ایسا مواد فراہم کرسکتی ہے کہ وہ کسی دلچسپ فسانے کی طرح محظوظ ہوسکے اگرچہ انہوں نے مستقل محنت اور مسلسل ترقیوں کے ساتھ ایک طویل عمر بسر کی لیکن جہاں تک خارجی حالات کا تعلق تھا اُن کی زندگی کے زیادہ تر ایام بالکل خاموش گزر گئے۔ بائیس برس کی عمر کے بعد دو تین سال کے لئے حالی[1] کے اس محیط زندگی میں تھوڑا سا ہیجان ضرور پیدا ہوگیا تھا، لیکن جوں ہی انگلو عربک اسکول دہلی سے اُن کا تعلق ہوگیا اور وہ دہلی میں سکونت پذیر ہوئے اس سمندر کا سارا مد و جزر ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا حسن اتفاق سے اس کے بعد بھی ایسے موقع ملتے گئے کہ انہوں نے اپنی تمام زندگی خاموشی اور سنجیدگی کے ساتھ دنیا کے پرفتن ہنگاموں سے دور رہکر گزار دی یہ ایک پرعظمت زندگی تھی، اور ہر پرعظمت زندگی کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ڈرامائی ہو!

یہ وہ زندگی تھی جس پر ایک ایسا سکوت چھایا ہوا تھا جو صرف ان وقتی آلام و مصائب سے ٹوٹتا ہے، جو ہر انسانی زندگی کے اجزاء لاینفک ہیں۔ کم عمری ہی میں ان کے والد اور والدہ کا سایہ اُن کے سر سے اُٹھ گیا۔ اور اسی طرح عہد شباب میں بھی ہندوستان اس رستخیز بیجا (۱۸۵۷ء) کے سبب اُن کی ملازمت بھی چھوٹ گئی، لیکن انہوں نے مرزا غالب یا میر تقی کی طرح نعرہائے دلخراش ہرگز نہیں بلند کئے اور نہ کبھی حادثات کا مقابلہ کرنے اور آگے بڑھنے کی کوشش کی قدرت نے بھی اُن کی اس سنجیدگی اور میر چشمی کا اس طرح بدلہ دیا کہ وہ کبھی گوشہ نشین نہیں ہونے پائے بلکہ ہر دفعہ ایک نت نئے طریقے سے اُن کی قدر و منزلت اور ترقی کے اسباب مہیا ہوتے گئے اور انہیں عزلت گزینی چھوڑ کر مختلف قسم کے ہنگاموں میں شریک ہونا پڑا۔

اردو ادب پر حالی کی ابتدائی نظر

یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ حالی کی سوانحعمری میں اندرونی دلچسپیوں کا بھی فقدان ہے جو کاروباری اور عملی ہستیوں کے مقابلہ میں ادبی شخصیتوں کے لئے ضروری قرار دیجاتی ہیں۔ جب شادی کے بعد اُن کا ذوق علم اُن کو دہلی لے گیا اور وہاں کی ادبی مجلسوں میں اُن کی آنکھیں کھلیں تو اُن کو ایک جہانِ دیگر نظر آیا جس میں ایک طرف تو غالب،

[1] حالی کی کوئی مبسوط سوانحعمری اب تک نہیں لکھی گئی اُن کی حیات سے متعلق دو چھوٹے چھوٹے رسالے جن میں سے ایک سیاب اکبرآبادی صاحب اور دوسرا سید محمد فاروقی صاحب کا مصنفہ ہے۔ اس وقت راقم کے زیر نظر ہیں، ان کے علاوہ جو معلومات اس مضمون میں ہیں وہ ایسی ہستیوں سے حاصل کی گئی ہیں جو حالی سے ذاتی طور پر واقف ہیں۔

اصغر علی محمد علی تاجر عطر سے ہر قسم کا عطر منگایئے

مومن، ذوق، نیر، شیفتہ، علوی، ممنون اور صہبائی وغیرہ کے ناموں سے شعر و سخن کا مذاق رکھنے والی مجلسیں ہمیشہ گرم رہا کرتی تھیں۔ اور دوسری طرف مفتی صدر الدین، شاہ عبد العزیز، فیض الحسن، سہارنپوری، مفتی عنایت احمد۔ مولانا اسمٰعیل شہید، احمد رضا خانصاحب بریلوی، محمد قاسم دیوبندی احمد علی سہارنپوری، مولانا فضل حق خیرابادی، سید احمد بریلوی۔ مولانا محمود الحسن، محمد فاروق صاحب چریا کوٹی۔ مولانا فضل الٰہی گنج مرادآبادی۔ اور عنایت رسول صاحب چریا کوٹی جیسی مایۂ فخر و ناز شخصیتیں[۵۱] دینیات اور مختلف علوم و فنون کے اثرات اپنے ماحول پر بٹھاتی جا رہی تھیں۔ اس کے علاوہ خود اردو زبان اس وقت تک متفرق آبیاریوں کے باعث اس قابل بن گئی تھی کہ اس میں ادب و انشا کے علاوہ متفرق علوم و فنون کی کتابیں لکھی جا چکی تھیں[۵۲] اور جن کی رفتار اس وقت بھی سرعت کے ساتھ رو بہ ترقی تھی اس قسم کے ماحول میں رہنے کے بعد نا ممکن تھا کہ حالی وہ تمام سبق حاصل نہ کر لیتے۔ جو روزمرہ کے تجربوں سے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اور نیز یہ کہ ان کی ذہنیاتی داستان ویسی ہی پرسکون رہتی، جیسا کہ اُن کا بیرونی گرد و پیش تھا۔

حالی کی ذہنی نشو و نما

حالی ابھی پچیس برس کے بھی نہ ہونے پائے تھے کہ وہ قیامت خیز واقعہ ظہور پزیر ہوا جس کے باعث ہندوستان کی تاریخ میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہوا۔ اس واقعہ کے اثر سے دراصل کئی حساس ہستیوں کو ایک ایسا تازیانہ لگا جس کے بعد اُن کے قدم ڈگمگائے بغیر نہ رہ سکے۔ اگرچہ حالی کی سنجیدہ طبیعت پر ظاہری حیثیت سے اس کا کوئی نمایاں اثر نہیں ہوا لیکن یہی وہ واقعہ ہے جس نے اُن کو ایک ایسے راستے پر ڈالدیا جس کے ذریعہ سے وہ غیر ارادی طور پر ایک عظیم الشان منزل تک پہونچ سکتے تھے۔

۱۸۵۷ء سے پہلے حالی ضلع حصار کے محکمۂ کلکٹری میں ملازم تھے لیکن اسی پرآشوب زمانہ نے اُن کی یہ جگہ چھوڑا دی اور حالی کو کچھ دن پریشان رہنا پڑا۔ اس کے بعد جب پنجاب بک ڈپو کی ملازمت مل گئی تو اگرچہ وہاں کا ماحول ان کے لئے دلچسپ (بلکہ قابلِ برداشت) نہ تھا جس کی وجہ سے انہوں نے بعض اہم ناک صدائیں بھی بلند کی ہیں لیکن یہی سنگِ بنیاد ہے اُس عظیم الشان ادبی عمارت کا جس کو حالی اپنی آخر عمر تک بناتے رہے۔ لاہور بک ڈپو نے حالی کے لئے ایک ایسے دبستان کا کام کیا جس کی خوشہ چینیوں کے باعث اُن کی طرزِ تحریر اور ذوقِ ادب میں خاص طور پر اصلاح ہوئی ہندوستانی انشا پردازوں کو راہ راست پر لاڈالنے کا کام اگرچہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے قدر دانان اردو نے بھی کیا تھا لیکن اس بک ڈپو نے حالی کے ساتھ جو کام کیا وہ بالکل جداگانہ تھا۔ حالی کو یہاں مغربی زبانوں سے ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی اصلاح اور نظر ثانی کرنی پڑتی تھی اور اگرچہ انکو مغرب کی کوئی ایک زبان بھی نہیں آتی تھی لیکن وہ خوش قسمت تھے کہ اُن کو مغربی مذاق ادب اور طرزِ تحریر سے نہایت آسانی کے ساتھ آگاہی ہو گئی۔ اس بارہ میں وہ اور اُن کے ساتھ اردو ادبیات کرنل ہالرائڈ کے مرہونِ منت ہیں جن کی نگرانی میں حالی کی اس قسم کی قوتوں کی نشو و نما ہوئی۔ خواجہ حالی اردو کے انشا پردازوں میں وہ سب سے پہلے شخص ہیں جو مغرب کے اُن تمام اسرارِ سخنوری اور انشا پردازی پر حاوی ہو گئے جن کے رازہائے سربستہ بغیر مغربی زبانوں پر کافی دسترس حاصل کئے کبھی بے نقاب نہیں ہو سکتے۔!

[۵۱] ان کے متعلق دیکھو (ا) سیر المصنفین جلد اوّل (ب) یادگار غالب (ج) حیات جاوید (د) رسالہ سہیل جلد ۲ نمبر ۲

[۵۲] دیکھو انڈیا آفس لائبریری کی اردو کتابوں کی فہرست جو تقریباً تین سو صفحات میں تمام ہوئی ہے، اور جس میں صرف ۱۸۵۷ء سے قبل کی اردو کتابوں کا تذکرہ ہے۔

تمباکو خوردنی۔ قوام۔ ہر قسم کا نفیس عطر۔ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگایئے

بک ڈپو کی ملازمت کی چار سالہ مدت اگرچہ خانگی حالات کے لحاظ سے حالی پر بہت شاق گزری لیکن اس عرصہ میں ان کے دماغ نے ایسے ایسے تخم حاصل کرلئے جس پر آگے چلکر نہایت ہی شاداب اور تناور درخت پیدا ہونے والے تھے۔!!

انگلو عربک اسکول دہلی اور حالی کی ابتدائی نثری تصانیف

مغربی ادبیات کے ترجموں سے جس قسم کے نقوش تاثر حاصل کئے جاسکتے تھے اُن تمام کو اپنے دل و دماغ پر ثبت کرنے کے بعد حالی انگلو عربک اسکول دہلی میں منتقل ہوئے یہاں اگرچہ وہ زمانہ اور ماحول باقی نہیں رہا تھا جس میں ان کے عہدِ شباب کی سرگرم گھڑیاں چند ہی سال قبل بسر ہوچکی تھیں لیکن پھر بھی دہلی لاہور کے مقابلہ میں حالی کے لئے پسندیدہ مقام تھا۔ چنانچہ یہاں آنے کے بعد جہاں اُن کی خانگی پریشانیوں کا خاتمہ ہوگیا ان کی ذہنی ترقی بھی جو اب تک جاری تھی ایک خاص مرتبہ کو پہنچ گئی۔ جس کے بعد سے اُن کی باضابطہ تحصیل علم ادب گویا ختم ہوگئی۔

لاہور اور دہلی کی ملازمتوں کے زمانہ میں حالی کی زندگی کن کن حالات سے ہوکر گزری ہے اُن کی تفصیل پیش کرنا اُن کے سوانح نگار کا کام ہے۔ ہم اپنے اس مضمون میں ان کی ہستی کے صرف اس پہلو کو نمایاں کرنا چاہتے ہیں جو اردو نثر سے متعلق ہے۔ حالی نے ابتداً اردو نثر میں جو کچھ لکھا ہے اُس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) تریاق مسموم اُس زمانہ کے عام مذاق کے مطابق حالی کی ذہنیت بھی اول اول مذہب کی طرف بہت راغب تھی، چنانچہ طالب علمی ہی کے زمانہ میں انیس بیس برس کی عمر میں انہوں نے صدیق حسن خاں بہادر (جو مابعد نواب بھوپال ہوئے) کے کسی وہابیانہ مسئلہ کی تائید میں ایک رسالہ عربی زبان میں لکھا تھا۔[1] تریاق مسموم انھوں نے اپنے ایک ہموطن نو عیسائی عمادالدین کے اعتراضات کے جواب میں لکھی تھی۔ یہ کتاب ۱۸۶۸ء سے پہلے لکھی گئی تھی۔

(۲) حالی کی اردو نثر کی دوسری کوشش "پادری عمادالدین کی تاریخ محمدی پر منصفانہ رائے ہے" اس کتاب کا موضوع بھی جیسا کہ ظاہر ہے مذہبی ہے۔ یہ کتاب غالباً شایع نہیں ہوئی۔[2]

(۳) تیسرا کارنامہ مولود شریف ہے یہ ۱۸۶۴ء سے ۱۸۷۰ء کے درمیانی زمانہ کی کوشش ہے۔ مولود شریف کا صحیفہ حالی کی وفات کے بعد اتفاق سے اُن کے خانگی کاغذات سے برآمد ہوا۔ جو شایع ہوچکا ہے اس کی بعض عبارتوں کے نمونے ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں تاکہ حالی کی ابتدائی نثر کی نوعیت اور اس کا اسلوب واضح ہوجائے اور نیز ان کے آخری زمانے کی طرز تحریر کے ساتھ اُس کو جو تعلق ہے اس کا بہ آسانی اندازہ کیا جاسکے۔

"الٰہی ہماری کیا مجال اور کیا تاب و طاقت جو تیری نعمتوں کا شکر ادا کرسکیں۔ تو قدیم ہم حادث، تو خالق ہم مخلوق، تیری نعمتیں بے انتہا"

"ہماری ابتدا بھی فنا اور انتہا بھی فنا، اگر ہم نے زبان سے تیرا شکر ادا کیا، یا دل سے تیرا احسان مانا، یا بدن سے تیری خدمت بجالائے"

"تو اس سے حق بندگی ادا نہیں ہوتا"

(صفحہ ۳۔ مولود شریف مطبوعہ حالی پریس پانی پت)

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھو حیات حالی از سید محمد فاروق صاحب صفحہ ۳۵

[2] یہ اور تریاق مسموم دونوں کتابیں راقم کی نظر سے نہیں گزریں ان کے متعلق معلومات کے ماخذ صرف سید محمد فاروق اور سیماب صدیقی صاحبان کے حیات حالی کے متعلق چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں۔

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگالیے

"اے امت محمدؐ! یہ تم نہیں جانتے کہ یہ اختصاص تم کو کہاں سے ملا؟ اور کیوں ملا؟ یہ سب اس ذات بابرکات کا طفیل ہے جس کی بدولت ایک تم کیا، تمام عالم، نعمت وجود سے بہرہ مند ہوا۔ وہ جو آدم سے پہلے نبی تھا اور خلق کی ہدایت کو سب سے پیچھے بھیجا گیا۔ جس کے امتی ہونے کی موسیٰ علیہ السلام سے اولوالعزم نے آرزو کی۔ جس کی نبوت میں ساری نبوتیں یوں محو ہو گئیں جیسے دھوپ میں ستارے جس نے روز الست ربوبیت کا اقرار سب سے پہلے کیا، جس کا نام مبارک عرش مجید اور جنت کے دروازوں پر لکھا گیا۔ جس پر ایمان لانیکا اور جس کی نصرت کرنے کا عہد انبیا سے لیا گیا،، (صفحہ ۸)

"بعضے لوگوں نے بپاس ادب چاہا کہ آپ کو مسند پر بیٹھنے سے روکیں۔ عبدالمطلب نے منع کیا اور کہا کہ یہ فرزند ارجمند کچھ نہ کچھ اپنی ذات میں شرف و بزرگی پاتا ہے جو یوں بے باکانہ دادا کی مسند پر آ بیٹھتا ہے، میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اس کو کوئی مرتبہ عالی ملنے والا ہے جو آج تک عرب میں کسی کو ملا ہے نہ ملے" (صفحہ ۶۳)

۴۔ حالی نے اسی زمانہ میں طبقات الارض پر اردو میں ایک ترجمہ بھی کیا تھا۔ اصل کتاب فرانسیسی زبان میں تھی جس کو مصر کے کسی عالم نے عربی میں منتقل کیا تھا۔ اسی عربی ترجمے سے حالی نے اس کو اردو کا لباس پہنایا۔[۵۱]

۵۔ اس سلسلہ کی آخری اور سب سے زیادہ اہم تصنیف مجالس النساء ہے۔ یہ کتاب اسی زمانہ میں شائع ہو چکی تھی۔ اس کے سرورق پر لکھا ہے کہ "جس کو الطاف حسین حالی مدرس مدرسہ اینگلو عربی دہلی نے عورتوں کے لئے تصنیف کیا اور جو جناب لفٹنٹ کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر مدارس ممالک پنجاب کے حکم سے لاہور کے سرکاری مطبع میں چھپی۔ ۱۸۸۳ء" یہ کتاب تعلیم نسواں کے متعلق ہے اس کے دو حصے ہیں اور دونوں حصے ملاکر چھوٹی تقطیع کے کوئی ڈیڑھ سو صفحات ہوتے ہیں "اس کتاب کے صلہ میں تعلیمی دربار دہلی کے موقع پر آپ کو گورنمنٹ کی جانب سے چار سو روپیہ کا اعزازی انعام بھی عطا ہوا جو لارڈ نارتھ بروک کے ہاتوں آپ کو ملا تھا۔ یہ کتاب غالباً پنجاب کے مدارس میں کچھ عرصہ تک داخل کورس بھی رہ چکی ہے"[۵۲]

مجالس النساء کئی وجوہ سے ایک اہم تصنیف ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ حالی کی اس قبیل کی پہلی اور آخری کوشش ہے۔ حالی نے اس کے بعد کبھی فسانہ نویسی کی طرف توجہ نہیں کی۔ دوسرا قابل ذکر امر جس کا اظہار ہمارے اس مضمون سے خاص طور پر متعلق ہے اس کتاب کی طرز تحریر ہے اس کا ایک سرسری مطالعہ بھی اس امر کا یقین دلانے کے لئے کافی ہے کہ اس کا مصنف ایک ایسا شخص ہے جو مغربی طرز تحریر سے اچھی طرح واقف ہے چنانچہ اس کتاب کی ابتدا حسب ذیل مطالعہ سے شروع ہوتی ہے جو نہایت اصلی اور سادہ ہے:۔

اتوجی! آداب

برخوردار بوڑھ سہاگن! بیگم یہ تمہارے ساتھ اور کون ہیں؟

ہیں اتوجی! آپ نہیں جانتیں؟ میری بھتیجی ہیں۔

اے کون ہیں؟ مریم زمانی؟

---

۵۱ نہیں معلوم کہ یہ کتاب چھپی بھی ہے کہ نہیں صرف سید محمد فاروق صاحب کی حیات حالی میں اس کا ذکر ہے۔

۵۲ دیکھو حیات حالی از سید محمد فاروق صفحہ ۱۶

حضرت بندگی۔

بھلا بُڑھیا بہت سی عمر، میاں جیئے، بچے جئیں۔ بوا! تم کہاں؟

جی، میں ابھی آکے اتری ہوں۔

آؤ بیوی بیٹھ جاؤ۔ کہو مزاج تو اچھا ہے۔

حضرت خدا کا شکر ہے۔

بچے اچھے ہیں؟

سب آپ کو دعا کہتے ہیں"

حالی کی یہ کتاب اس قابل ہے کہ اس پر تفصیل کے ساتھ تنقیدی نظر ڈالی جائے، اور کئی پہلوؤں سے اس کا مطالعہ کرکے نذیر احمد کی اسی قسم کی مصنفات کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا جائے، لیکن ہمارے اس مضمون کے حدود اس قدر وسیع نہیں ہیں اس لئے ہم ذیل میں اس کتاب کے چند اور اقتباسات پیش کرتے ہیں کہ اردو داں حضرات کو (جن میں سے بہت کم حالی کی اس تصنیف سے واقف ہیں) معلوم ہوجائے کہ انھوں نے نذیر احمد کی طرز میں بھی کس کامیابی کے ساتھ قلم اُٹھایا ہے۔ یہ کتاب اب بہت کم پائی جاتی ہے، لیکن ضروری ہے کہ اس کو دوبارہ شایع کیا جائے اور نیز نصاب تعلیمی میں بھی (خصوصاً زنانہ مدارس کے) شامل کیا جائے۔

"کیا تم اس بات پر بھولی ہو کہ باپ کے گھر میں خدا کا دیا سب کچھ موجود ہے؟ واری ایسا خیال ہرگز نہ کرنا۔ بس خدا بُری گھڑی ہی نہ لائے نہیں تو ایک دم میں کچھ کا کچھ ہوجاتا ہے۔ ہماری تو کیا بساط ہے جب بُرا وقت آتا ہے تو ملک کے وارث ایک ایک روٹی کو محتاج ہوجاتے ہیں۔ خیر نادرگردی اور شاہ گردی کو تو ایک زمانہ گزرا، اِسے جانے دو، یہ تو کل کی بات ہے کہ جب غلام قادر نے شاہ عالم کی آنکھیں نکالیں تو قلعہ اور شہر پر کیسی کیسی مصیبتیں پڑیں" (مجالس النسا حصہ اول صفحہ ۵۵)

"لو بوا زبیدہ خاتون کا قصہ سن لیا۔ دیکھو اس کی ماں نے بیٹی کو پڑھا لکھا کر کیسا قابل کر دیا۔ کیا ہم آدمی نہیں ہیں، ہم چاہیں تو اس سے زیادہ اپنی اولاد کو آدمی بنالیں پر ویسی لیاقت کہاں سے لائیں۔

حضرت قصور معاف ہو تو کہوں، اس سے یہ کیونکر نکلا کہ مائیں بیٹوں کو بھی پڑھا سکتی ہیں، ذکر تو میرے احمد مرزا پر چلا تھا، آپ اس پر زبیدہ خاتون کا قصہ لے بیٹھیں" (مجالس النسا حصہ دوم ابتدائی عبارت)

"غرض سید عباس نے دو مہینہ کے بعد اسلام بیگ اور غلام امام اور خواجہ بدیل کو ہندوستان کی طرف چلتا کیا اور وہ زبیدہ خاتون کو دلی سے لیکر عرب چلے گئے، اوّل حج کیا پھر مدینہ شریف کی زیارت کی، وہاں سے استنبول کا راستہ لیا، جب زبیدہ خاتون وہاں پہنچ گئی چند روز کے بعد سید عباس کی شادی ایک بہت بڑے امیر کی بیٹی سے ہوگئی۔ سب نے دہلی کا رہنا اختیار کیا۔ بس یہ قصہ تمام ہوا خدائے تعالیٰ ہر ایک کو ایسی ماں اور ہر ایک ماں کو ایسی اولاد عنایت کرے۔ آمین"

(مجالس النسا حصہ دوم آخری عبارت)

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو کا عطر ضرور خریدنا چاہیئے۔

اردو ادب میں انقلاب حالی جس زمانہ میں پیدا ہوئے اس سے ایک دو سال قبل ہی سے اردو نثر میں انقلاب شروع ہو چکا تھا، چونکہ وہ فارسی کی جگہ عدالتوں کی زبان بن گئی تھی، اس لئے قانون اور حکومت کی وہ تمام اصلاحیں جو پہلے بالعموم فارسی تھیں اب اردو میں منتقل ہوتی جا رہی تھیں۔ اس کے بعد ہی گورنمنٹ کو سرکاری مدارس کے لئے ایسی کتابیں تیار کرانی پڑیں جن کے موضوع مغربی طرز کے تھے۔ اسی سلسلہ میں ۱۸۳۵ء میں جب اخباروں کو آزادی مل گئی تو دہلی سے کئی اخبار نکلنے لگے ان تمام کا اثر یہ ہوا کہ اردو پڑھنے اور لکھنے والوں کی ذہنیتوں میں تبدیلی ہونے لگی جو ۱۸۵۷ء تک مسلسل ترقی کرتی گئی، لیکن اس کے بعد جب سرسید نے مغربی خیالات و حالات سے متاثر ہو کر قوم کی اصلاح و ترقی کا جھنڈا بلند کیا اور مخالفین و موافقین دونوں کو طرح طرح سے اپنی طرف متوجہ کیا تو قومی اصلاحوں اور کامیابیوں کے ساتھ ہی ساتھ اردو زبان کی رفتار میں بھی خاص ہیجان پیدا ہو گیا، اور یہی وہ ہیجان ہے جو آج اردو کو ہندوستان کی جگت بھاشا بنانے میں سرگرم ہے۔

سرسید نے کئی طریقوں سے اردو کی خدمت کی، پہلے انہوں نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جس کا مقصد ہر قسم کی علمی کتابوں کو مغربی زبانوں سے اردو میں منتقل کرنا تھا، اس کے بعد ایک اخبار نکالنا شروع کیا جو اس سوسائٹی کا ترجمان خیال کیا جاتا تھا۔ آخر میں انہوں نے وہ قابل یادگار کام کیا جو اردو ادبیات میں ہمیشہ ان کا نام زندہ رکھیگا۔ یہ کام ماہوار رسالہ تہذیب الاخلاق کی اشاعت تھی یہ وہ رسالہ ہے جس نے ہندوستان کے خوابیدہ علم و ادب کو اپنی غیر معمولی علمی نفسی سے زندہ کیا اور جس میں اردو کے عناصر خمسہ کی نشو و نما ہوئی۔ انہیں عناصر خمسہ میں سے ایک حالی بھی ہیں سرسید کے خیالات سے متاثر ہونے کے بعد حالی نے اردو نثر میں جو کچھ لکھا ہے وہ اردو کے لئے مایۂ صد نازش و افتخار ہے۔

سرسید اور حالی دونوں میں تقلید کا رجحان بہت زیادہ تھا۔ شدت تقلید ہی تو تھی جس نے سرسید کو صد درجہ بدنام کر رکھا تھا۔ لیکن ساتھ ہی اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ سرسید کی تقلید میں جدت اور اختراعی قوت کے مظاہر بھی موجود تھے، اسی وجہ سے یہ بدنامی پائدار اثرات نہیں قایم کر سکی۔ یہی حال مولوی حالی کا ہے۔ وہ سرسید کی ہستی کو کئی لحاظ سے قابل تقلید سمجھتے تھے اور صرف یہی نہیں، وہ سرسید کے اس قدر گرویدہ تھے کہ ایک دو دفعہ علی الاعلان کہدیا کہ سرسید ہی وہ ہستی ہے جس نے مجھے اپنا بنا لیا ؎

آں دل کہ رم نمودہ از خوبروجواناں،
دیرینہ سال پیرے بُردش بیک نگاہے

سرسید کی طرز تحریر سرسید کی نثر جدید خیالات کی اشاعت کا ایک زبردست آلہ تھا اس سے انہوں نے اس وقت کام لیا تھا جب کہ اردو زبان میں کوئی نثر (صحیح معنوں میں) موجود نہ تھی۔ اُن کی طرز تحریر کی بعض خصوصیات ذیل میں اس لئے پیش کی جاتی ہیں کہ اُن سے حالی کی طرز تحریر کا مقابلہ کیا جائے۔

(۱) وہ تصنع اور الفاظ کی تراش خراش سے نفرت رکھتے تھے۔

(۲) وہ اِن غلط لفظوں کو جو عام فہم ہوں اور خاص و عام کی زبان پر جاری ہوں، صحیح لفظوں پر ترجیح دیتے تھے، اس کے علاوہ دلی کی بول چال پر بھی قانع نہ تھے۔

(۳) وہ الفاظ و قواعد کا محکوم رہنا پسند نہ کرتے تھے بلکہ الفاظ و قواعد کو اپنے جذبات و خیالات کا محکوم رکھتے تھے۔

ہر عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ملتا ہے

(۴) تشبیہوں اور استعاروں سے زیادہ کام نہیں لیتے تھے، جو کچھ تشبیہیں اور استعارے اُن کی عبارتوں میں ہیں سب برمحل اور مہیا ہیں۔

(۵) وہ اکثر دفعہ واقعات اور مناظر کی تصویریں ننگی کھینچا کرتے تھے۔

(۶) مختلف مضامین مثلاً علمی، مذہبی، اخلاقی، سیاسی، قانونی، ظریفانہ وغیرہ میں سے ہر ایک کو اسی پیرایہ میں لکھتے تھے جو اُس کے لئے بالکل مناسب ہو۔

سرسید اور حالی کی ذہنیتیں

سرسید اور حالی کی ذہنیتوں اور اُن کی نوعیت کا اس وقت صاف طور پر پتہ چل جاتا ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ سرسید جس طرح اگرچہ تقلید کی طرف بہت جلد راغب ہو جاتے تھے، لیکن کبھی ادباً ذہنی تقلید نہیں کرتے تھے، بالکل اسی طرز پر مولوی حالی بھی عمل پیرا رہکر اکثر اپنی ذاتی اپج سے کام لیتے ہیں۔

اگرچہ اُن کی طرز انشاپردازی پر سرسید کا گہرا اثر پڑا، لیکن ساتھ ہی انھوں نے اپنی شخصیت کو بھی برقرار رکھا۔ سرسید کے اسلوب سے وہی باتیں اخذ کیں جن کو وہ اچھی سمجھتے تھے۔ چنانچہ اُن سے متاثر ہونے کے بعد حالی نے جو کچھ لکھا، اس کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ کرنل ہالرائڈ نے جس اعلیٰ مذاقی اور جدید طرز روش کو حالی سے روشناس کرایا تھا، اب اس میں کافی ترقی ہوگئی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرسید کے اسلوب میں جو جو نقائص باقی رہگئے تھے ان کو حالی نے اپنے اسلوب میں بالکل دور کر دیا اور جو جو خوبیاں تھیں اُن کو اور بھی چمکا دیا۔

حالی کی طرز تحریر

حالی کے متفرق مضامین[1]، اُن کا مقدمہ شعر و شاعری، اُن کی یادگار غالب اور حیات سعدی کے مطالعہ کے بعد ہم اُن کے اسلوب بیان کی جو خصوصیات قایم کرسکتے ہیں وہ اس امر کی کافی شہادت دیتی ہیں کہ حالی کا اسلوب سرسید کی طرز تحریر کی ایک ترقی یافتہ، پختہ اور جامع شکل ہے، چنانچہ اُن کی طرز تحریر کی بعض نمایاں خصوصیات یہ ہیں:-

(۱) اُن کی عبارتوں میں ظرافت، شوخی، اور طعن و تشنیع بالکل نہیں، برخلاف اس کے وہ ہر بات کو سنجیدگی اور متانت سے ادا کرتے ہیں۔

(۲) اُن کے کلام میں فارسی و عربی کے موٹے موٹے الفاظ اور اس قسم کی جدید ترکیبیں بہت کم ہیں، جو آج کل کے نوجوان انشاپردازوں میں بہت کم پائی جاتی ہیں۔

(۳) وہ بازاری، سوقیانہ اور مبتذل الفاظ استعمال نہیں کرتے۔

(۴) تشبیہوں، استعاروں اور تلمیحوں سے بہت کم کام لیتے ہیں۔

(۵) ان کی تحریریں خود پرستی اور تعلی نہیں پائی جاتی اور اگرچہ وہ خود کو کبھی بڑا عالم و ادیب ظاہر کرنا نہیں چاہتے لیکن اکثر جگہ اُن کی اعلیٰ علمیت اور ادبیت ظاہر ہو جاتی ہے۔

(۶) وہ حتی الوسع اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اُن کی عبارت منطقی حدود سے باہر نہ ہونے پائے۔

---

[1] واضح ہو کہ حالی نے تیس سے زیادہ بڑے بڑے مذہبی تنقیدی اور علمی مضامین لکھے ہیں، ان کا مجموعہ ۱۹۰۴ء میں مولانا وحید الدین سلیم نے چھپوایا تھا جو اس وقت کم یاب ہے اور اب حیدرآباد سے مولوی احمد عارف مولف بزم اُردو، اور خیابانِ اردو کی سعی بلیغ سے شایع ہو رہا ہے۔

اصغر علی محمد علی سے ہر قسم کا عطر طلب فرمایئے

حالی کی انفرادیت

ان خصوصیات کے معلوم کرنے کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ حالی نے سر سید کی محض تقلید نہیں کی بلکہ اپنی ذات سے بھی اپنے اسلوب میں اس قدر قابل وقعت تبدیلیاں کیں کہ ان کا اسلوب اُس زمانہ کی اردو نثر اور اُس کی نوعیت کا ایک بہترین نمونہ بن گیا۔

انہی متذکرۂ بالا خصوصیات میں سے بعض ایسی بھی ہیں جن کی وجہ سے حالی کی عبارتیں عوام میں خاص طور پر مقبول نہو سکیں۔ اور اگر اس بارے میں وہ سر سید کی بعینہ تقلید کرتے تو بہت ممکن تھا کہ اُن کی نثر زیادہ عام پسند ہو جاتی۔ لیکن حالی کی خوددار انفرادیت نے اس امر کو ہرگز گوارا نہیں کیا کہ وہ سر سید احمد خاں کے اسلوب کی اس خصوصیت کو بھی اختیار کر لیتے جو اُن کی نظر میں سنجیدگی اور علمی وقار کے خلاف تھی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے سر سید اور حالی کے اسالیب میں امتیازی شان جلوہ گر ہونے لگتی ہے۔

حالی کی نثر کیوں عام طور پر مقبول نہیں ہوئی

عام اردو داں مولوی حالی کی عبارتوں کو اس لئے خشک سمجھتے ہیں اور پسند نہیں کرتے کہ :-

(۱) ان میں ایشیا کے (اور بالخصوص اس زمانہ کے) عام مذاق کے مطابق یورپ والوں اور جدید خیالات پر طعن و تشنیع نہیں کی جاتی۔ نیز مخالفوں پر اعتراضات کے علاوہ اُن کے حملوں کے سخت سے سخت جوابات نہیں دیئے جاتے۔

(۲) اُن میں شوخی، ظرافت اور رنگینی نہیں پائی جاتی بلکہ سنجیدگی اور متانت پڑھنے والے کو گراں گزرنے لگتی ہے۔

(۳) اُن میں نئی نئی اور عجیب و غریب ترکیبیں، عربی و فارسی کے مرکب الفاظ، اور رنگا رنگ تشبیہیں اور استعارے بہت کم نظر آتے ہیں۔ حالانکہ یہی چیزیں سطح آشنا نظروں پر اثر ڈالنے کے لئے نہایت ضروری ہیں۔

(۴) اُن میں استدلالی پہلو بہت زیادہ ہوتا ہے، شاعری اور عبارت آرائی نہیں ہوتی۔

ذیل میں حالی کی بعض ان عبارتوں کے نمونے پیش کئے جاتے ہیں جو سر سید سے متاثر ہونے کے بعد لکھی گئی تھیں اور جن میں متذکرہ بالا خصوصیات کی جھلک بہت دکھائی دیتی ہیں :-

"(۱) جس قدر ہم کو اس بات کا یقین ہے کہ عالم موجود ہے اُسی قدر ہم کو اس بات کا بھی یقین ہے کہ ہم سب کام اپنے اختیار سے کرتے ہیں۔ اور جیسا ہم کو پہلے یقین میں ایک نہایت ضعیف احتمال اس بات کا رہتا ہے کہ شاید یہ تمام نمایش عالم خواب کی سی نمایش ہو؛ ویسا ہی ایک ضعیف احتمال اس بات کا رہتا ہے کہ شاید ہمارے یہ سب افعال و حرکات ایسے ہوں جیسے قطب نما کی سوئی کی حرکت۔ لیکن ایسے ضعیف احتمالات سے یقین زائل نہیں ہو سکتا۔"

(مضمون تدبیر صفحہ ۵ مطبوعہ سلسلہ تالیفات وکیل ٹریڈنگ کمپنی امرتسر)

"(۲) شیخ کے کلام سے بھی جا بجا یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیشتر بے سر و سامانی اور متوکل درویشوں کی طرح سفر کرتا رہا ہے، اور بعض موقعوں پر اس کو حالت سفر میں نہایت سخت تکلیفیں اور ایذائیں پہنچی ہیں"

(حیات سعدی صفحہ ۳۵ مطبوعہ نیو امپیریل پریس لاہور ۱۸۸۶ء)

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر منگانا چاہیئے۔

"(۳) مرزا کے اخلاق نہایت وسیع تھے، وہ ہر ایک شخص سے جو اُن سے ملنے جاتا تھا بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے جو شخص ایک دفعہ اُن سے مل آتا تھا اس کو ہمیشہ اُن سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا، دوستوں کو دیکھکر وہ باغ باغ ہو جاتے تھے، اور اُن کی خوشی سے خوش اور اُن کے غم سے غمگین ہوتے تھے۔ اس لئے اُن کے دوست ہر ملت و مذہب کے نہ صرف دہلی میں بلکہ تمام ہندوستان میں بیشمار تھے"

(یادگار غالب صفحہ ۵۰ مطبوعہ فیض عام پریس علی گڑھ)

"(۴) رہی دوسری بات سو اس کا تو ہمارے شعرا نے کبھی بھولکر بھی خیال نہیں کیا جو باتیں بے شرمی کی ہوتی ہیں وہاں اور بھی پھسل پڑتے ہیں اور نہایت فخر کے ساتھ ناگفتنی باتوں کو کھلم کھلا بیان کرتے ہیں"

(مقدمہ شعر و شاعری صفحہ ۳۱۹ مطبوعہ الناظر پریس لکھنو)

حالی کی انشاپردازی کے نقائص

ان اقتباسات کے ملاحظے کے بعد جہاں ہمیں حالی کی متانت اور پختہ کارانہ تحریر کا ثبوت ملتا ہے وہیں اُن کے اسلوب کی ایک دو خصوصیات نقائص کی شکل میں بھی دکھائی دینے لگتی ہیں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ اُن کے اسلوب کی ایک دو خصوصیات نقائص معلوم ہونے لگتی ہے اور اکثر جگہ ادبی شان باقی نہیں رہتی، اگرچہ ایک ایسے زمانہ میں جبکہ اردو میں ہر طرف رنگین اور پرتکلف عبارتیں لکھنے کا عام شوق اور مذاق پھیلا ہوا ہے اس قسم کا ردعمل ضروری تھا اور اس حیثیت سے حالی کی یہ کوششیں ضرور قابل قدر ہیں۔ لیکن وہ آنے والی نسلوں کے لئے ایک اعلیٰ انشاپردازی کا زندہ نمونہ ہرگز نہیں بن سکتیں۔ انشاپردازی کا دارومدار خود حالی کے خیال کے مطابق صرف خیالات پر نہیں بلکہ الفاظ پر بھی ہے[1]۔ چنانچہ اسی امر پر انھوں نے اپنے مقدمہ دیوان (یعنی شعر و شاعری) میں زیادہ بحث کی ہے اور بعض جگہ حد اعتدال سے بھی متجاوز ہو گئے ہیں۔

اقتباسات بالا میں دوسری چیز جو کھٹکنے لگتی ہے وہ انگریزی طرز بیان کی تقلید ہے۔ پہلے بھی یہ ذکر گذر چکا ہے کہ سرسید کی طرح حالی بھی تقلید کی طرف زیادہ راغب تھے اور ان دونوں کی تقلیدیں ادبا دھند نہیں ہوتی تھیں۔ تاہم حالی نے اس انگریزی کی تقلید کی خاطر ایک ایسی یادگار چھوڑی ہے جو کسی وقت بھی پڑھنے والے پر اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی اور وہ حیات سعدی میں سعدی کو "ان" اور "ان کی" کے بجائے "وہ" اور "اُسکی" کا استعمال ہے یہ اردو دانوں کے لئے ایک نئی بلکہ معیوب چیز ہے۔ حالی جب غالب اور سرسید کی زندگی کے واقعات لکھنے بیٹھتے ہیں تو آپ اور اُن کا استعمال کرتے ہیں، لیکن جب سعدی کا حال لکھتے ہیں "جن کی عظمت کسی حیثیت سے ان دونوں سے کم نہ تھی" تو وہ اور اس کا استعمال کرتے ہیں یہ وہ برائی ہے جو حیات سعدی کا مطالعہ کرتے وقت اکثر جگہ پڑھنے والے کے ذہن کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔

حالی کی تحریروں کا ایک اور نقص جو اقتباسات بالا میں ظاہر نہیں ہوتا انگریزی الفاظ کا بے دھڑک استعمال ہے، وہ اردو کو ہندوستان کی عام زبان بنانے کے لئے ضروری سمجھتے تھے کہ اس میں متفرق زبانوں کے الفاظ اور ترکیبیں فیاضی کے ساتھ استعمال کی جائیں اور اس خیال پر وہ اس حد تک کاربند ہو گئے تھے کہ بعض بعض مقامات پر انگریزی کے ایسے ایسے نامانوس الفاظ استعمال کر دیئے ہیں جن کا مفہوم اردو الفاظ کے ذریعے آسانی سے ادا کیا جا سکتا تھا۔ اس قسم کے بعض الفاظ ملاحظہ ہوں۔

[1] دیکھو مقدمہ شعر و شاعری مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ۔

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر سے منگانا چاہئیے۔

Affliate, Graduates, Imagination, works. Christianity, oriental, Biografphy, leading article Civilization, remarks, Literary point, circle life –

حالی کی نثر اور حیات جاوید

علمی اور ادبی لحاظ سے حیات جاوید حالی کا زبردست شاہکار ہے چونکہ یہ اُن کی آخر عمر کی پیداوار ہے اس لئے اُن کی مخصوص طرزات کی جس قدر مکمل ترجمانی اس کتاب سے ہوتی ہے اُن کی کسی اور تصنیف سے نہیں ہوتی، حیات جاوید اور حالی کی دیگر مصنفات کے اسلوب میں کچھ فرق ضرور نمایاں نظر آتا ہے۔ - اور وہ یہ ہے کہ حیات جاوید کے اکثر جملے بہ نسبت حیات سعدی اور یادگار غالب کے جملوں کے زیادہ طویل ہیں اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ سرسید کی لائف لکھتے وقت چونکہ اُن کو ایک مختصر کتاب کے ذریعہ بہت زیادہ مطالب کو پیش کرنا مقصود تھا اس لئے بڑے بڑے مرکب جملے لکھنے پڑے، مثلاً حسب ذیل جملوں سے ظاہر ہو جائیگا کہ وہ کس طرح کئی کئی مطالب ایک دو جملوں ہی میں ادا کر جاتے ہیں:۔

"دوسرے آرٹکل میں جس کا عنوان" ورنیکلر یعنی ہماری زبان "ہے انھوں نے اوّل ان مشکلات کو بیان کیا ہے جو مغربی علوم کو دیسی زبانوں میں ترجمہ کر کے شایع کرنے میں پیش آتی ہیں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا کلکتہ میں ایک سوسائٹی کتابوں کا ترجمہ کرنے کے لئے قایم کرنا، پھر دہلی کالج میں بہت سی کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہونا اور پھر اسی مقصد کے لئے سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کا قایم ہونا اور تینوں جگہ ناکامی کے سوا کوئی نتیجہ حاصل نہ ہونا نہایت عمدگی سے ظاہر کیا ہے" (حیات جاوید۔ طبع دوم صفحات ۲۹۴-۲۹۵)

"سب سے بڑا فائدہ جو اس مجلس کے انعقاد سے ہوا وہ یہ تھا کہ ہر سال مسلمانوں کی ایک جماعت کثیر جس کی تعداد بعض اجلاسوں میں ہزار ہزار سے متجاوز ہو گئی نہ کسی سیر اور تماشہ کی غرض سے، کسی حاکم کے حکم سے اور نہ کسی ذاتی منفعت کے لئے، بلکہ محض اس خیال سے کہ جو مجمع قوم کی بھلائی کے ارادہ سے ہوتا ہے اس میں شریک ہوں۔ دور دراز سفر کی تکلیف اور آمد و رفت کا خرچ برداشت کر کے کانفرنس کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے، ایک دوسرے سے ملتے تھے، ایک جگہ کھانا کھاتے تھے، ایک جگہ رہتے تھے، قومی معاملات پر گفتگو کرتے تھے۔ ہنستے تھے، بولتے تھے، انجانوں میں تعارف پیدا ہوتا تھا۔ دوستوں میں خلوص بڑھتا تھا، اور اس طرح ایک مردہ قوم کے اجزا میں روز بروز التیام پیدا ہو جاتا تھا"[ل]

"ان کا ارادہ سر ولیم میور کی چاروں جلدوں کا جواب لکھنے کا تھا جس میں صرف ایک جلد لکھنے پائے تھے کہ ولایت میں ٹھہرنا ناممکن ہو گیا اور ہندوستان میں پہنچکر کچھ تو اس وجہ سے کہ یہاں آکر وہ کالج کی فکر میں مصروف ہو گئے، اور زیادہ تر اس سبب سے کہ جو کتابیں لندن میں باسانی میسر آسکتی تھیں اُن کا ہندوستان میں کہیں وجود نہ تھا وہ ارادہ پورا نہ ہو سکا مگر جو مباحث سر ولیم میور کی کتاب میں زیادہ اہم تھے اُن میں سے چند کے سوا سب تفصیلی یا اجمالی جواب اس ایک جلد میں آگیا ہے۔" (حیات جاوید طبع دوم صفحہ ۲۳۸)

مولوی حالی کے اسلوب کی یہ خصوصیت کہ وہ بہت سنجیدہ رہتے ہیں حیات جاوید میں ایک زبردست نقص کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اسکی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ حالی نے ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز ماحول کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا لیکن وہ اس قدر سنجیدہ انسان تھے کہ جب سر سید کو اس "رستخیز بیجا" کے درمیان پیش کرتے ہیں تو اس متانت اور بے پروائی کے ساتھ عبارت آرائی کرتے ہیں کہ گویا یہ ایک بالکل معمولی واقعہ ہے، حالانکہ یہ ایک ایسا مقام تھا جہاں ایک زبردست ادیب کے سمند جذبات

ل۔ حیات جاوید طبع دوم صفحہ ۱۲۵

اثر سے اس کا دماغ یقیناً "محشر خیالات بن سکتا ہے۔ چنانچہ خود سرسید اور ان کے علاوہ غالب، آزاد اور نذیر احمد وغیرہ جن جن انشاپردازوں نے بھی اس "رستخیز بے جا" کا ذکر کیا ہے، وہ سب اپنا متاثر ہونا پوشیدہ نہ کر سکے، ایک زبردست ادیب کا اہم ترین فرض یہی ہے کہ وہ جس واقعہ سے متاثر ہو اس کی تصویر اس قدر جذبلی اور پرجوش کھینچدے کہ دیکھنے والے پر بھی اس کا گہرا اثر ہو حیاتِ جاوید کا تیسرا باب (جس میں سرسید اور غدر کی حالت کا اظہار کیا ہے) شروع سے آخر تک پڑھ جائیے، لیکن کہیں اس امر کا پتہ نہیں چلتا، کہ لکھنے والے نے متاثر ہو کر لکھا ہے۔

اسی طرح سرسید (حیات جاوید کے ہیرو) کی وفات کا جہاں حال لکھا ہے جوش و جذبات کو بالکل طاق میں رکھدیا ہے، ورنہ یہ ایک ایسا مقام تھا جہاں انہیں اپنی سنجیدگی کا نقاب دور کر کے ضرور قلبی کیفیت ظاہر کر دینی چاہیے تھی۔

حالی کی شخصیت اُن کی تصنیفات میں

اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے کہ ہر انشاپرداز کی شخصیت اُس کی تحریروں میں کبھی ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتی تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حالی کی شخصیت کی جھلکیں بھی اُن کی تحریروں میں کہیں نہ کہیں ضرور نمایاں ہو جایا کرتی ہیں، ان میں سب سے زیادہ حصہ اُن کی متانت اور سنجیدگی کا ہے "حالی کی متانت مقتضی تھی، کہ محفل میں مٹھکر واہ وا کہنا تو کجا آہ بھی نہیں کھینچنا چاہیئے۔ جس قدر آزاد کی شخصیت ان کی تحریروں میں پھٹی پڑتی ہے اتنی ہی حالی کی طبیعت چھپی رہتی ہے، وہ کبھی ظاہر ہونا نہیں چاہتے"[۵۱] مگر باوجود اس کے بعض موقعوں پر وہ ظاہر ہوئے بغیر بھی نہیں رہ سکتے۔ اس بارے میں وہ اردو کے لارڈ میکالے ہیں۔ کیونکہ جس طرح آزاد کارلائل کی طرح اپنے جوش و جذبہ سے مجبور ہو کر ہر وقت ظاہر ہوتے رہتے ہیں، حالی بھی میکالے کی طرح سنجیدگی اور خود داری قایم رکھنے کا التزام کرتے ہیں اور جس طرح میکالے کی تحریروں میں ذاتی معتقدات و امیال کی جھلک نمودار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ حالی کی عبارتیں بھی کہیں نہ کہیں اپنے مصنف کی قلبی گہرائیوں اور دماغی کیفیتوں کا پتہ دیجاتی ہیں[۵۲] اس کی بعض مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) ایک جگہ وہ تہذیب الاخلاق کی غیر معمولی کامیابی اور اس کے اسباب بیان کرتے ہوئے اپنی طرزِ تحریر کی ایک بڑی خصوصیت پر خاص زور دیتے ہیں یعنی یہ کہ "اس تہذیب الاخلاق میں مخالفوں کے اعتراضات کے جواب نہایت سخت ضرورت کے سوا کبھی نہ دیے جاتے تھے اور اس لئے مناظرہ کے لئے بےمزہ رد و بدل اور جواب اور رد جواب و کد جواب و حد جواب کے ناگوار تسلسل سے وہ بالکل پاک تھا"[۵۳]

(۲) حیاتِ جاوید میں ایک اور جگہ انہوں نے اپنی فطری سنجیدگی، بے تعصبی اور سلیم الطبعی کا غیر ارادی طور پر اظہار کیا ہے اُن کا خیال ہے کہ اردو ہندوستان کی جگت بھاشا بنکر رہے گی، اور ہندوؤں کی مخالفت آخر کار ناکام ثابت ہوگی اس ذاتی رائے کے اظہار کے لئے انہوں نے سرسید کے خیالات کا ذکر کرتے ہوئے اس امر پر زور دیا ہے کہ ہم کو اطمینان رکھنا چاہیئے کہ "جس تعلیم نے ہمارے ہندو نوجوانوں سے تعصب اور نفرت کرنا سکھایا ہے، وہی آگے چلکر اُن کو یہ سبق دے گی، کہ جب تک ہندو مسلمان مل جل کر نہ رہیں گے اور ایک دوسرے

---

۵۱ روح تنقید - دیباچہ صفحہ ۲۴

۵۲ یہاں چند جملے میں نے اپنے مضمون اردو کے اسالیب بیان سے ماخوذ کئے ہیں۔

۵۳ حیاتِ جاوید طبع دوم - صفحہ ۱۱۴

اصغر علی محمد علی سے ہر قسم کا عطر خریدنا چاہیے

کے مصالح کو ملحوظ نہ رکھیں گے تب تک برٹش انڈیا میں اصلی عزت حاصل نہیں کر سکتے"[1]

"اس موقع پر اس خاص واقعہ کا لحاظ رہے کہ سرسید کے خلاف مولوی حالی نے اس رائے کا اظہار کیا ہے۔ سرسید کو تو یقین تھا کہ "اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لئے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے"[2]

حالی نے خود سرسید کے الفاظ میں اس امر کا اظہار کیا ہے کہ "انہیں دنوں میں جب کہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا ایک دن مسٹر شکسپئر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا۔ اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے۔ آخر انہوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے .... میں نے کہا اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے جو زندہ رہیگا وہ دیکھے گا"[3] الخ

اس عبارت اور حالی کی ذاتی عبارت (جو اوپر پیش کی گئی ہے) کا مقابلہ کرنے کے بعد صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ اس موقع پر حالی اپنی شخصیت کو چھپا نہ سکے اور اپنے ہیرو کے خیالات کے خلاف اپنی رائے غیر ارادی طور پر پیش کر دی۔ واقعہ ہے کہ سنجیدہ سے سنجیدہ مصنف بھی اپنی تحریر میں اپنی شخصیت کو ظاہر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

(۳) اس کتاب کے دوسرے حصہ میں ایک جگہ حالی کی شخصیت ایسے ہی طریقے پر ظاہر ہو گئی ہے۔ اور یہ بات اس قدر اہم ہے کہ اس پر اس پوری کتاب حیات جاوید کی اہمیت کا انحصار ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مذہبی اصلاح کے خیال کو سرسید کی ترقی کا اہم ترین سبب ثابت کرنے میں انہوں نے اپنی ذاتی معتقدات کے مطابق عمل کرتے ہوئے، ایک زبردست اور اصولی غلطی کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سرسید نے ہندوستان کے مسلمانوں کی فلاح و بہبودی کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انہوں نے اسلام کی بالراست کوئی خدمت کی ہے یا اسلام نے (بحیثیت مذہب) اُن کو شاہراہ ترقی پر گامزن ہونے کے لئے مجبور کیا تھا، ایک ایسا شخص جس کی نظر میں جنت اور دوزخ کی کوئی حقیقت نہیں جس کے پاس شیطان اور جن کا کہیں خیال نہیں، جو معجزے کے قایل نہیں اور جس کے نزدیک اسلام ایک فلسفیانہ مذہب ہے[4]۔ بدقت تمام مذہب کی خاطر اس قدر جان جوکھوں کے کام کر سکتا ہے دنیا کے اکثر بڑے بڑے فاتح اور عظیم الشان ہستیاں وہی گزری ہیں جنہیں مذہب کی مادی جزا و سزا پر اعتقاد کامل تھا اور جو فرشتوں اور حوروں کو مرتے دم اپنی آنکھوں سے خوش آمدید کہتے ہوئے دیکھتی تھیں۔

یہ تعجب انگیز نظر آتا ہے کہ فلسفیانہ نقطہ نظر سے مذہب کو دیکھنے والا ایک شخص جو یہ جانتا ہے کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس کی اصلاح و درستی کی کوئی ضرورت نہیں اور جو بذاتِ خود جامع و مانع ہے، اس کی خرابیوں کو دور کرنے اور اس کی خوبیوں کو نمایاں کرنے کے لئے اسقدر سخت کوشش کرے!

---

[1] حیاتِ جاوید طبع دوم صفحہ ۹۷

[2] حیاتِ جاوید صفحہ ۹۴۔

[3] حیاتِ جاوید صفحہ ۹۴

[4] تفسیر قرآن از سرسید احمد خاں

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر خریدنا چاہیئے

اگر سرسیّد کے ماحول کو دیکھا جائے تو اس امر کا ثبوت بآسانی بہم پہنچ سکتا ہے کہ اس زمانہ میں اسلام کی بہ حیثیت مذہب نہایت اچھی حالت تھی اور مسلمان خاص طور پر دینداری کی طرف مائل تھے۔ چنانچہ خود حالی نے لکھا ہے "دار الخلافہ کا اخیر دور تھا اور مسلمانوں کی آخرت کی امیدوں کے سوا جن کا اسلام وعدہ کرتا تھا کوئی امید دنیا میں باقی نہ رہی تھی۔ اس لئے وہ مذہب کو زیادہ مضبوط پکڑتے جاتے تھے، خصوصاً شریف اور ممتاز خاندانوں میں مذہبی فرائض کی پابندی اور مذہبی باتوں کا چرچا بہت زیادہ تھا" [۵۱]

جب خود مسلمان اس شدت سے مذہب پر عمل پیرا تھے تو پھر سرسیّد کو اسلام کی طرف متوجہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ نہایت افسوس کا مقام ہے، کہ حالی نے (چونکہ خود نہایت دیندار اور متقی تھے) اس موقعہ پر ارادی یا غیر ارادی طور پر غلطی کی، اور اس امر کو اس شد و مد سے لکھا کہ یہی حصہ اسلوب بیان کی حیثیت سے اُن کی کتاب کا شہ پارہ بن گیا ہے۔ [۵۲]

سرسید کو اسلام کا درد نہیں اکھ رہا تھا بلکہ مسلمانوں کی ردی حالت اور یہ ردی حالت دینی نہیں تھی بلکہ دنیاوی، مسلمان دنیاداری میں بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ اور اسی میں ان کو راہ راست پر لانا سرسیّد کا عین مقصد تھا۔ اس مقصد کا تعلق بلاراست مذہب سے نہیں بلکہ قومیت سے ہے۔ مولوی حالی کا خیال کہ ہندوستانی قومیت کے خیال سے پہلے نا آشنا تھا اس لئے سرسیّد کو اب کس طرح اس کا خیال پیدا ہو سکتا ہے [۵۳] اور اگر پیدا ہو بھی تو کس طرح اس قدر دیرپا ہو کر بڑے بڑے کام کر دکھاتا ہے، بالکل سطحی معلوم ہوتا ہے۔ سرسید میں اگر قومیت کا خیال یکایک جوش و خروش کے ساتھ پیدا ہو گیا تو کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوئی۔ وہ زمانہ اور ماحول ہی ایسا تھا کہ کسی دردمند اور بلند حوصلہ شخص کو اس قسم کا خیال ضرور پیدا ہو جاتا۔ کہ یہ کس قدر مضحکہ خیز بات ہے کہ "جس طرح حالت موجودہ میں یہ ممکن نہیں کہ یورپ کے موجدوں اور مخترعوں کے حالات سن سن کر ہندوستان میں بھی ویسے ہی موجد اور مخترع پیدا ہونے لگیں، اسی طرح یہ بھی امکان سے خارج ہے کہ یورپ کے رفارمروں اور وطن دوستوں کے حالات کتابوں میں پڑھ کر یا زبانی سن کر ہندوستان میں بھی ویسے ہی ملک کے جاں نثار اور قوم کے مصلح پیدا ہو جائیں" [۵۴] کبھی کوئی بڑے کام دوسرے بڑے کاموں کی نظیر یا مثال سے نہیں کئے جاتے۔ اور کوئی بڑا شخص دوسری قوموں کے بڑے شخصوں کے حالات سن کر بڑا نہیں بنتا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے جہاں کہیں کسی ملک و قوم کو کسی بات کی ضرورت ہوتی ہے تو خواہ وہ کیسی ہی اجنبی اور نئی ہو وہ اس کو لامحالہ کر مٹتے ہیں، اور کرنے سے پہلے ان کو یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ ہم کیا کرنے والے ہیں، تاریخ عالم میں اس کی سیکڑوں مثالیں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ اگر کوئی شخص سرسید کی لائف اور ان کی تصنیفات سے واقف ہونے کے بعد اس متذکرہ مسئلہ پر نظر ڈالے تو اس کو صاف طور پر واضح ہو جائیگا کہ سرسیّد نے اپنا مطمح نظر قوم کو بنایا ہے نہ کہ مذہب کو ہم اس وقت اس مسئلہ کو طول دینا نہیں چاہتے۔ یہاں صرف اس امر کا اظہار مقصود تھا کہ حالی کی شخصیت کس طرح ان کی تصنیفات میں ظاہر ہو جایا کرتی ہے؟

---

۵۱ حیات جاوید صفحہ ۲۱۹

۵۲ حیات جاوید ۲۱۸ تا ۲۲۵

۵۳ حیات جاوید صفحہ ۲۱۷ تا ۲۱۸

۵۴ حیات جاوید ۲۱۷

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا اور تمباکو منگائیے

(۴) اس اظہار شخصیت کی ایک اور مثال مقدمہ (شعر و شاعری) میں بھی پائی جاتی ہے جہاں مولوی حالی شاعری کی اصلاح کا ذکر کرتے وقت اپنے متعلقہ واقعات کا ذکر کر جاتے ہیں اور اپنا نام ظاہر نہیں کرتے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "اگرچہ یہ ممکن ہے کہ نئی روش پر چلنے والا شاعر کوئی مضمون زمانہ کی ضرورت اور مقتضائے حال کے موافق شعر کے لباس میں جلوہ گر کرکے ملک کے جدت پسند لوگوں میں کچھ مقبولیت یا شہرت حاصل کرلے اور ایک خاص حیثیت سے اس کے کلام کی داد توقع سے زیادہ اس کو مل جائے، مگر شاعرانہ حیثیت سے نہ توفی الواقع وہ اس کے کلام کی داد ہوتی ہے اور نہ وہ اس کو داد سمجھتا ہے۔ بلکہ ایسی داد سنکر چپکے ہی چپکے اپنے دل میں یہ شعر پڑھتا ہے ؎

بخون آلودہ دست و تیغ غازی ماندہ بے تحسیں

تو اکنوں زیب ایوان و زینت برگستواں بینی!

شعرائے ہمعصر کچھ تو قدیم شعری کے تعصب سے اور زیادہ تر اجنبیت اور بیگانگی مذاق کے سبب اس روش کو اس حجت سے کہ وہ شارع عام سے الگ ہے تسلیم نہیں کرتے اور بعض اپنے نزدیک اس کی ہجو ملیح اس طرح فرماتے ہیں کہ فلاں شخص نے شاعری نہیں کی بلکہ مفید اور اخلاقی مضامین لکھکر اپنے لئے زاد آخرت جمع کیا ہے۔ لیکن اگر وہ فی الواقع موجودہ نسل کی قدرشناسی سے قطع نظر کرچکا ہے تو اس کو ایسی باتوں کی کچھ پرواہ نہ کرنی چاہئے بلکہ یہ امید رکھنی چاہیئے کہ قوم کی زمین میں کچھ آل باقی ہے تو تخم اکارت نہ جائیگا۔[۵۱]

واقعہ ہے کہ خود حالی کے اس شعر کے مطابق کہ ؎

سُنیں گے نہ حالی کی کب تک صدا

یہی ایک دن کام کر جائے گی

آخر کار اردو شاعری کی کایا پلٹ ہوگئی اور ان کا خیال صحیح ثابت ہوا۔ کیا اس متذکرہ بالا اقتباس سے صاف طور پر ظاہر نہیں ہوتا کہ اس میں حالی نے خود اپنی طرف اشارہ کیا ہے؟ لیکن بہت ممکن ہے کہ وہ غیر ارادی طور پر یہ لکھ گئے ہوں۔

حالی کی مصنفات میں ان کی بے لوثی

حیات جاوید، یادگار غالب اور مقدمہ شعر و شاعری میں اکثر ایسے مقامات بھی تھے جہاں حالی اپنی ذات کے متعلق بہت کچھ شرح و بسط کے ساتھ لکھ سکتے تھے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی فطرت میں تعلی نام کو نہ تھی، وہ پہلے تو اپنا ذکر کرنے سے حتی الوسع پرہیز کرتے تھے، لیکن جہاں کہیں اس پر مجبور ہوجاتے ہیں تو اس خاکساری سے اپنا ذکر کرتے ہیں کہ ان کی شخصیت کی ایک خاص عظمت نمودار ہونے لگتی ہے، مثلاً یادگار غالب میں جہاں مرزا کی نثر اردو پر ریویو کیا ہے میر مہدی مجروح کے متعلقہ خط میں انہوں نے نہایت عاجزی اور صداقت کے ساتھ اپنے متعلق لوگوں کے خیالات کی تردید کی ہے۔[۵۲]

اردو کے بڑے بڑے نقاد اور سنجیدہ انشا پردازوں کی مصنفات میں بھی اس قسم (یعنی تعلی اور خود نمائی) کے عیوب پائے جاتے ہیں، آزاد کی اکثر تحریروں میں اس کی جھلک نمایاں ہے۔ خدا رکھے نواب حیدر یار جنگ طباطبائی کی شرح دیوان غالب اور تلخیص عروض و قافیہ ایسی

---

۵۱ مقدمہ شعر و شاعری مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ، صفحات ۲۵ اور ۲۶

۵۲ یادگار غالب مطبوعہ فیض عام علی گڑھ صفحہ ۱۵۹

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر خرید فرمایئے

مثالوں سے خاص طور پر مالا مال ہیں، علامہ شبلی جیسا ہمہ دان انشا پرداز بھی اس عیب سے بچ نہ سکا۔ شعرالعجم حصۂ اول میں جہاں رودکی کا بیان ہے مولانا نے اس کے مشہور قصیدے کا ذکر کیا ہے۔ جس کا پہلا شعر ہے[51]

بوے جوئے مولیاں آید ہمے　　　یاد یار مہرباں آید ہمے

اور اس کی شرح میں جہاں امیر معزی کے قصیدے کا ذکر کیا ہے ان کو اپنا بھی ایک قصیدہ یاد آگیا ہے جو سر آسمان جاہ بہادر وزیر اعظم حیدرآباد دکن کی علی گڑھ میں تشریف آوری کے متعلق لکھا گیا تھا[52]

حالی کو اپنی مصنفات میں اپنی نظموں اور ذاتیات کے پیش کرنے کا کئی جگہ موقع حاصل تھا، لیکن ان کی فطری بے لوثی نے انہیں اس امر کی اجازت نہیں دی۔ اس کی بعض مثالیں ذیل میں پیش کش ہیں۔

۱۔ مقدمۂ شعر و شاعری میں جہاں انہوں نے گولڈ اسمتھ کی شاعری کی سرخی کے تحت اس کی ایک نظم کا اظہار کیا ہے، وہ اپنی اس نظم کو پیش کر سکتے تھے جو شعر کو مخاطب کر کے (گولڈ اسمتھ کی اسی نظم کے ترجمہ کے طور پر) لکھی گئی تھی[53] نیز اسی کتاب میں ان کی وہ نظمیں بھی کہیں نہ کہیں درج ہو سکتی تھیں جو دلی کی شاعری کے تنزل کے عنوان سے لکھی گئی تھیں[54]

۲۔ حیات جاوید اور یادگار غالب میں حالی کو کافی موقع تھا کہ وہ سرسید اور غالب کے ساتھ اپنی خانگی تعلقات کے متعلق ایک عنوان قایم کر لیتے۔ یا کم از کم کسی دوسرے عنوان کے ضمن میں ان کا ذکر کر دیتے۔

۳۔ حالی نے مرزا غالب کا جو عالی شان اور درد ناک مرثیہ[55] لکھا تھا وہ یادگار غالب میں غالب کی وفات کے ذکر کے ساتھ درج کیا جا سکتا تھا۔ نیز انھوں نے غالب کی جو تاریخ[55] وفات لکھی تھی اس کا ذکر بھی اس موقع پر بے جا نہ تھا۔

۴۔ حیات جاوید میں جگہ جگہ (متن میں یا حاشیوں پر) اس قدر موقع حاصل تھا کہ وہ اپنی ان تمام نظموں کو داخل کر سکتے تھے جو انہوں نے موقع بموقع سرسید اور ان کے کاموں کے متعلق لکھی تھیں۔ اگرچہ انہوں نے دوسروں[56] کی اس قسم کی نظمیں درج کی ہیں لیکن کہیں اپنی کوئی نظم نہیں پیش کی۔ ان کی جو نظمیں حیات جاوید میں کسی نہ کسی جگہ درج ہو سکتی تھیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) قصیدۂ ناتمام۔ مرقومہ ۱۲۹۴ھ سرسید احمد خاں کی شان میں (دیوان حالی صفحہ ۱۳۸)

(۲) قصیدۂ مرتبہ ۱۳۰۹ھ جو حیدرآباد میں محمڈن کالج ڈپوٹیشن کی طرف سے پڑھا گیا تھا (دیوان حالی ۱۴۵)

---

۵۱ دیکھو شعرالعجم حصۂ اول صفحہ ۲۵ مطبوعۂ انوار المطابع لکھنؤ۔

۵۲ دیوان حالی صفحہ ۱۳

۵۳ دیوان حالی صفحہ ۲ مطبوعۂ الناظر پریس لکھنؤ۔

۵۴ دیوان حالی صفحہ ۱۲۷

۵۵ دیوان حالی صفحہ ۱۸۰

۵۶ حیات جاوید دوسرا ایڈیشن صفحہ ۱۲۸۔ نظم مولوی صفدر حسین مرحوم

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر منگانا چاہیے۔

۳۔ قطعہ۔ مرتبہ ۱۳۰۹ھ جو حیدرآباد میں محمڈن کالج ڈپوٹیشن کی طرف سے پڑھا گیا تھا۔ (دیوان حالی ۱۴۸)

۴۔ ترکیب بند۔ مرتبہ ۱۳۰۹ھ جو ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ میں پڑھا گیا (دیوان حالی صفحہ ۱۵۰)

۵۔ تاریخ بنائے چاہ درحوالۂ مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ بحسن سعی جناب آنریبل سر سید احمد خاں بہادر (دیوان حالی صفحہ ۱۸۴)

۶۔ ترکیب بند۔ مرتبہ ۱۳۲۰ھ جو ایجوکیشنل کانفرنس دہلی میں پڑھا گیا (دیوان حالی صفحہ ۱۶۴)

۷۔ سید احمد خاں کی تکفیر (دیوان حالی صفحہ ۱۷)

۸۔ سید احمد خاں کی مخالفت کی وجہ (دیوان حالی صفحہ ۱۹)

۹۔ سید احمد خاں کی تصانیف کی تردید (دیوان حالی صفحہ ۲۳)

۱۰۔ علی گڑھ کالج کیا سکھاتا ہے (کلیات نظم حالی جلد اول صفحہ ۵۰)

اردو نثر میں حالی کا درجہ

حالی کی نثری خدمات پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد ہم اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ جس طرح عام طور پر انکو شاعری کی حیثیت سے اہمیت دیجاتی ہے اور ایک نئے دبستان سخن کا بانی قرار دیا جاتا ہے نثر کے لحاظ سے بھی اُن کی مصنفات ادبیات اردو کے ایک جزو لاینفک ہیں اور ایسے جزو لاینفک جو اُن کی شاعری کی طرح ادبیات اردو میں ایک نئے اور ضروری باب کے اضافہ کے باعث ہیں۔ اس وقت بھی جب کہ اردو کا سرمایۂ نثر کافی ترقی کر چکا ہے اگر مولوی حالی کی نثری خدمات کو اس سے علیحدہ کر لیا جائے تو ایک ایسا فقدان نظر آئیگا جس کی تلافی شاید ہی متعدد انشا پردازوں کی متفقہ کوششوں کے بعد بھی ایک عرصہ تک ہو سکے واقعہ یہ ہے کہ حالی کی نثری تصانیف ادبیات اردو کی بساط کے ایسے پیوند ہیں جن کے بغیر اس کی بدنمائی ہرگز نہیں چھپ سکتی۔

اگرچہ اردو نثر میں سب سے پہلے جدید طرز کی علمی و ادبی کتابیں لکھنے کا سہرا مولوی محمد حسین آزاد کے سر ہے لیکن اُن کا اسلوب بیان کچھ اس قسم کا ہے کہ وہ معیاری اردو کی کتابیں نہیں قرار دی جا سکتیں۔ آزاد اپنی تحریروں میں اس قدر بے تکلف ہو جاتے ہیں کہ ہر جگہ اپنی ذات کے متعلق کچھ نہ کچھ کہے بغیر نہیں رہ سکتے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی حساس شخص خانگی ملاقات میں میٹھی باتیں کر رہا ہے۔ یہی حال مولوی نذیر احمد کا ہے، وہ اس معاملہ میں ایک طرح سے آزاد سے بھی بڑھ گئے ہیں آزاد کی عبارتیں پڑھتے وقت یہ سمجھ میں آتا ہے کہ کوئی شخص گھر میں بیٹھکر بے تکلف گفتگو کر رہا ہے لیکن نذیر احمد کی تحریروں سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا مصنف بازاروں اور گلی کوچوں میں چکر لگاتے ہوئے عوام سے بات چیت کر رہا ہے۔ حالی نے اپنے اسلوب کے ذریعہ ان دونوں زبردست خرابیوں کو دور کر دیا، اور سنجیدہ و علمی مضامین کو اس طرح لکھنا شروع کیا کہ پڑھنے والا اُن سے مرعوب ہو جائے اور اس کو معلوم ہو کہ یہ ایک علمی بحث ہے۔ اس قسم کے اسلوب کی اس زمانہ میں سخت ضرورت تھی کیونکہ یہ ایک ردعمل تھا اردو کی اُن پرانی طرز کی تحریروں کا جن میں مواد اور کام کی باتیں تو بہت کم ہوتی تھیں لیکن لفظی خوبیوں اور ظاہری صناعیوں کا خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا تھا، یہ حالی جیسے سنجیدہ اور اعلیٰ مذاق رکھنے والی ہستی ہی کا کام تھا کہ جہاں اردو کو ایک طرف بیجا جکڑبندیوں سے نکالنے کی کوشش کی تو دوسری طرف اس امر کا بھی لحاظ رکھا کہ وہ بالکل آزاد ہو کر بازاری اور مبتذل نہونے پائے۔

اسلوب کی خوبی کے علاوہ حالی کی نثری مصنفات نوعیت موضوع و مضامین کے لحاظ سے اُن کے ہم عصروں میں اُن کو ممتاز رکھتی ہیں یہ پہلے ادیب ہیں

ہر قسم کی خوردنی تمباکو اور ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگایے

یہ پہلے ادیب ہیں جنھوں نے تنقیدی خیالات کو اردو میں روشناس کرایا۔ حالی سے قبل اردو کے کسی انشا پرداز نے بھی اس طرح غیر جانبدارانہ تنقید نہیں پیش کی تھیں۔ اگرچہ آزاد نے آب حیات میں اس فرض کو انجام دینا چاہا ہے، لیکن ان کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ غیر جانبدار نہیں رہ سکتے، وہ جگہ جگہ اپنے ذاتی معتقدات سے کام لیتے ہیں اور اس بات پر غور کرنے کی کوشش نہیں کرتے کہ میں کس کے ساتھ انصاف کر رہا ہوں، اور کس کے حق میں ظلم؟ مولوی نذیر احمد تو اس مرد کے میدان ہی نہیں۔ برخلاف ان دونوں کے حالی کو قدرت کی جانب سے ایک تنقیدی دماغ عطا ہوا تھا۔ اگرچہ انہوں نے فن تنقید پر کچھ نہیں لکھا، لیکن وہ انشا پردازوں کا بالمقابلہ مطالعہ کرنے میں خاص طور پر اعلیٰ مذاق سے کام لیتے تھے غیر جانبدار تنقیدی خیالات کی جس قدر فراوانی ان کی تحریروں میں پائی جاتی ہے، اس زمانہ کے کسی اور انشا پرداز کی مصنفات میں نہیں پائی جاتی، یہی وہ زبردست امتیاز ہے جس کے باعث حالی نے . . . . اردو ادب میں ایک اہم رتبہ حاصل کر لیا ہے اور جس کے اثر سے آج تک اردو کے تنقید نگاروں کی خاص رہبری ہوتی رہی ہے۔

اردو شعرا نے جہاں حالی کی نئی طرز کی نظموں کو آنے والی شاعری کے صحیح نمونے سمجھکر ان کی تقلید کرنی شروع کی ان کے دیوان کے دیباچہ اور مقدمہ کے مطالعہ کے بعد یہ معلوم کیا کہ یہ نمونے کیا اہمیت رکھتے ہیں اور ہم کو ان کی تقلید کس طرح کرنی چاہیے؟ اگر حالی کی نظمیں ملک وقوم کے سامنے ان کے نثری مقدمہ اور دیباچہ کے بغیر پیش ہوتیں تو ان کا اثر اردو کے شاعروں پر اس قدر دیرپا نہ ہوتا۔

حالی نے نہ صرف نمونے پیش کر دیے، بلکہ ان نمونوں کو آنیوالی نسلوں کے لئے چراغ راہ بنانے کی خاطر ان کی خوبیوں ضرورت اور اصولوں پر بھی روشنی ڈالدی، اس میں کوئی شک نہیں کہ مولوی محمد حسین آزاد نے بھی اس قسم کے نمونے ضرور پیش کئے ہیں، اس میں اولیت کا فخر انہیں کو حاصل ہے اور ان کی بعض نظمیں حالی کی بعض نظموں سے یقیناً بلند پایہ قرار دیجا سکتی ہیں لیکن وہ اتنی مقبول نہ ہو سکیں جتنی حالی کی نظمیں ہوئی ہیں۔ حالی نے ایک اعلیٰ وارفع مقام پر پہنچکر عام روش کے خلاف نہ صرف ایک زور دار اور انوکھی آواز بلند کی ہے بلکہ آواز سنکر ان کی طرف متوجہ ہونے والوں کے لئے ایسے نقش قدم بھی چھوڑ دیے ہیں جن پر چلنے کے بعد ہر شخص اس اعلیٰ مقام تک پہنچ سکتا ہے جہاں سے حالی نے صدا دی تھی۔

تنقید نگاری کے بعد حالی کا زبردست نثری کارنامہ ان کی سوانح عمریاں ہیں۔ جس طرح اردو تنقید نگاروں میں ان کو اولیت کا رتبہ حاصل ہے سوانح عمری کو روشناس کرانے میں بھی حالی سب سے پیش پیش ہیں، فن سوانح نگاری اگرچہ مشرق کے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہے، لیکن حالی سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے یورپ کی جدید ترین طرز سوانح نگاری کے مطابق ہندوستان میں بیٹھکر سوانح عمریاں لکھنی شروع کیں۔ مورخانہ تدقیق، حالات و واقعات سے منطقی طور پر نتیجوں کا استخراج اور جس کی سوانح عمری لکھی جائے اس کے کارناموں اور زندگی میں غور وخوض کرنے کی ابتدا حالی ہی نے کی اور ان کے بعد اردو کے جس قدر انشا پردازوں نے سوانح نگاری کی طرف توجہ کی ان سب کو غیر ارادی طور پر حالی ہی کی تقلید کرنی پڑی اس بارے میں علامہ شبلی جیسی ہستی بھی حالی کی خوشہ چیں نظر آتی ہے۔ اگرچہ شبلی کا دائرہ عمل اسلوب بیان اور نوعیت مضامین دونوں کے لحاظ سے حالی کے جولانگاہ سے بہت زیادہ دلچسپ اور وسیع تھا لیکن جب انہوں نے سوانح نگاری کی طرف توجہ کی تو انہیں بھی حالی کی پیش کردہ نمونہ کو اختیار کرنا پڑا یہ حالی کی صحت مذاق کی دلیل ہے کہ شبلی جیسا بلند پایہ شخص بھی انہی کے اصول پر کاربند ہوتا ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں سے اردو نثر میں حالی کی اہمیت ایک خاص انفرادی شان کے ساتھ جلوہ گر ہونے لگتی ہے۔

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر ملتا ہے

حالی دنیا کی ان خوش قسمت ہستیوں میں سے تھے جو اپنے ہاتھ سے لگائے ہوئے پودے کو اپنی آنکھوں سے پروان چڑھتا ہوا دیکھکر فخر حاصل کر سکتے ہیں۔ انہوں نے جس قدیم پیرایۂ تحریر کارد عمل شروع کیا تھا وہ اُن کی زندگی ہی میں حرف غلط بنکر رہ چکا تھا۔ اُن کی نئے رنگ کی نظموں نے انھی کے سامنے پرانے اور بدوضع رنگوں کی شاعری کو اپنے وسیع دامنوں میں محو کر لیا۔ ان کے ثقہ اور سنجیدہ تنقیدی خیالات نے ایک طرف تو قدیم بے راہ روی اور بدمذاقی کے خرمنوں کو بجلی بن کر جلا دیا اور دوسری طرف بوستانِ علم و ادب کے نونہالوں کو ابرنیساں بن کر سرسبز و شاداب بنا دیا۔

اس کامگار انسان کی مسرت و اطمینان کی کوئی حد بھی ہو سکتی ہے جس نے اپنی جوانی میں جن کاموں کے کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا ان کو اپنے بڑھاپے تک فتحمندی کے ساتھ انجام کو پہنچا دیا ہو!!

اپنے فرائض سے سبکدوش ہونے اور اپنی امیدوں کو بار آور پانے کے بعد اگر حالی کو وہ اطمینان و سکوت نصیب نہ ہوتا جو ان کی آخر عمر میں انکو حاصل ہوا تھا اور جس کے بعد انہوں نے کوئی بڑا ادبی کام نہیں پیش کیا تو فطرت کی اس سے بڑھکر احسان فراموشی اور ناقدردانی کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی۔

سید محی الدین قادری زور بی اے

لسان الغیب حافظ شیرازیؒ کی مکمل سوانحعمری اور ان کے دیوان کی بہترین شرح جلد اوّل تین روپیہ جلد دوم عا
کاس الکرام۔ عمر خیام کے مفصل حالات زندگی اور رباعیات کی مکمل شرح، اس موضوع پر اردو میں پہلی کتاب ہے قیمت ے
نمکدان فصاحت۔ فارسی عربی، اردو کے بہترین علمی، ادبی، تاریخی لطائف قیمت عہ
بندگی۔ امام ابن تیمیہ کی مشہور کتاب "العبودیت" کا مکمل ترجمہ حقایق دینی و تصوف کی بے نظیر کتاب قیمت عہ
مطالبۂ فطرت (مجلد) مصنفہ محمد فاروق ایم۔ اس۔ سی، فلسفۂ اسلام پر بے مثل کتاب قیمت عہ
سالومی، اسکر وائلڈ کے نہایت مشہور ڈرامہ کا مکمل اردو ترجمہ قیمت ۱۲
فتنۂ خلق قرآن امام عبدالعزیز بن یحییٰ کی کتاب الحیدہ کا ترجمہ مسئلہ قرآن کے متعلق ایک بے نظیر محاکمہ ۱۰
حلقۂ مسموم۔ کینن ڈائل کے علمی فسانہ کا اردو ترجمہ عہ
جہاں آرا بیگم۔ شاہزادی جہاں آرا بیگم کی نہایت مستند و دلچسپ تاریخ ۸
تذکرہ بلھے شاہ پنجاب کے نہایت مشہور بزرگ کے تاریخی حالات مستند ذرائع سے ۸
بادۂ ناب۔ فارسی رباعیات مصنفہ میر ولی اللہ بی۔ اے عہ
یادگار غالب۔ قیمت تین روپیہ۔
کلیات حالی (نظم) قیمت ۱۲
منیجر نگار بھوپال سے طلب فرمائیے

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر منگائیے

لیلیٰ مجنوں

من شکی البلوی فقد ضل الطریق

(برکات شیخ الشیوخ استاد الاساتذہ حضرت مولانا محمد فاروق صاحب چریا کوٹی رح)

یہ نظم اس وقت کی یادگار ہے جب مولانا شبلیؒ اعظم گڈھ میں حضرت شیخ رح سے پڑھتے تھے، فلسفہ کی کوئی کتاب درس میں تھی، مولانا کے ایک ہم سبق نے حضرت شیخ رح سے اپنے ایک مہربان قدیم کی شکایت کی، حضرت شیخ رح نے یہ نظم فی البدیہہ لکھکر شکایت کرنے والے کو رضائے دوست کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی تعلیم دی۔

آں شنیدستی کہ لیلےٰ بیشتر — بذل کردے بر گدایاں سیم و زر
بر در آں ماہوش از ہر طرف — آمدندے سائلاں کاسہ بکف
روزے مجنوں ہم آں شوریدہ حال — بر در آں ماہ شد بہر سوال
دید جوش بر گدایاں پیش و پس — گرد لیلائے شکر لب چوں مگس
داخل آں جمع گشت و گردیش — کاسہ دریوزہ را چوں چشم خویش
دید چوں آں ماہ کاں شوریدہ حال — شد بجمع سائلاں بہر سوال
از تغافل تافت رخ زاں خوش نظر — بر گدایاں گشت محو بذل زر
دامن سائل نمود آں سیم و زر — ہر طرف چوں چشم مجنوں گہر
چوں باخر نوبت مجنوں رسید — دل درون سینۂ عاشق تپید
بود حیران جمال آں صنم — فارغ از اندیشۂ لطف و ستم
آتش سودائے قلبش چوں گرفت — کاسہ را خود از کف مجنوں گرفت
بر زمیں زد کاسہ و بشکست خرد — قیس دندان ہوس بر دل فشرد
شد فرو لختے بہ غرقاب خیال — بعد ازاں شد از فرح در وجد و حال
ہر کہ دید آں حال گفتا اے شگفت — جائے گریہ خندہ ات چوں در گرفت
گفت مجنوں با یکے زاں کار رفیق — من شکی البلوی فقد ضل الطریق

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنوٴ سے منگانا چاہیئے

THE SLAVERY

By M. A. Rahman Chughtai

لیلیٰ مجنوں

من شکی البلوی فقد ضل الطریق

(برکات شیخ الشیوخ استاد الاساتذہ حضرت مولانا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی رح)

یہ نظم اس وقت کی یادگار ہے جب مولانا شبلیؒ اعظم گڑھ میں حضرت شیخ رح سے پڑھتے تھے، فلسفہ کی کوئی کتاب جس میں تھی، مولانا کے ایک ہم سبق نے حضرت شیخ رح سے اپنے ایک مہربان قدیم کی شکایت کی، حضرت شیخ رح نے یہ نظم زبانی بطور شکایت کرنے والے کو رضائے دوست کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی تعلیم دی۔

آں شنیدستی کہ لیلیٰ بیشتر　　بذل کردے بر گدایاں سیم و زر
بر در آں ماہوش از ہر طرف　　آمدے سائلاں کاسہ بکف
روزے مجنوں ہم آں شوریدہ حال　　بر در آں ماہ شد بہر سوال
دید جوش بر گدایاں پیش و پس　　گرد لیلائے شکر لب چوں مگس
داخل آں جمع گشت و گرد پیش　　کاسۂ دریوزہ را چوں چشم خویش
دید چوں آں ماہ کاں شوریدہ حال　　شد مجمع سائلاں بہر سوال
از تغافل تافت رخ زاں خوش نظر　　بر گدایاں گشت محو بذل زر
دامن سائل بود آں سیم و زر　　ہر طرف چوں چشم مجنوں پر گہر
چوں بآخر نوبت مجنوں رسید　　دل درون سینۂ عاشق تپید
بود حیران حسب حال آں صنم　　فارغ از اندیشۂ لطف و ستم
آتش سودائے قیسش چوں گرفت　　کاسہ را خود از کف مجنوں گرفت
بر زمیں زد کاسہ و بشکست خرد　　تیر بے دنداں چوں در دل فشرد
شد فروستہ بہ عتاب خیال　　بعد ازاں شد از فرح در وجد و حال
ہر کہ دید آں حال گفتا اے شگفت　　جائے گریہ خندہ است چوں در گرفت
گفت مجنوں با لیلیٰ نداں کاں رفیق　　من شکی البلوی فقد ضل الطریق

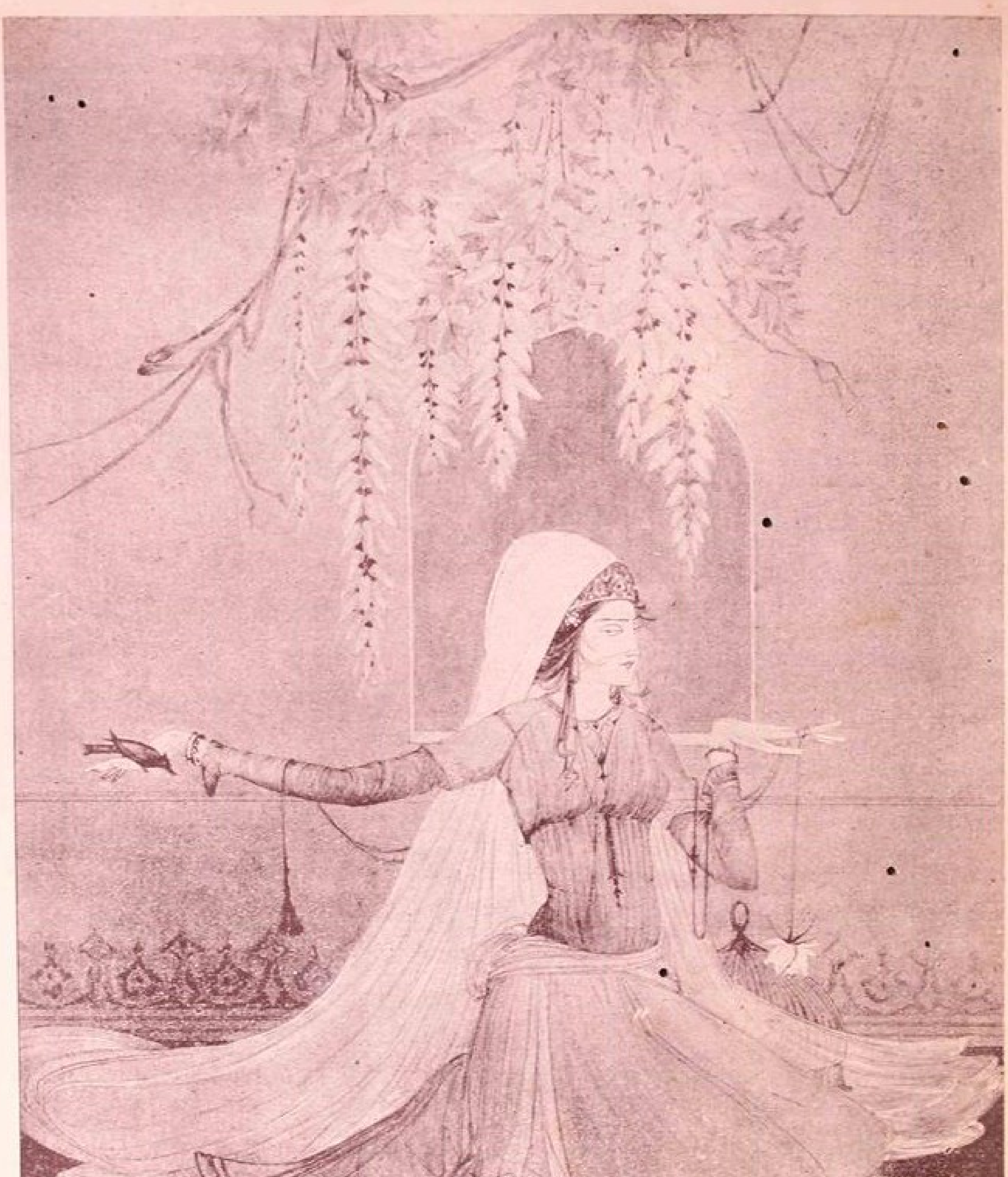

THE SLAVERY
By M. A. Rahman Chughtai

ہر کہ خورسند از جفائے دوست نیست — در طریقت آشنائے دوست نیست
ہر چہ از یاد آید از جور و ستم — گشت بر ما شہد و بر بیگانہ سم
خرم آں ساعت کہ آں تابندہ ماہ — از تغافل ساخت با ضبطِ نگاہ
اے خوش آں ساعت کہ کرد آں صنم — گردنِ ما زیر شمشیرِ ستم
قتل و ذبح از وے نہ در د کلفت است — عیدِ قرباں اہلِ الفت است
حبذا امیدے کہ تیغ آں صنم
بر گلوئے او کند مشق ستم

مرسلہ (کیفی چریاکوٹی)

درد (کاکوروی)

گل بقطار یکطرف — رقصِ ہزار یکطرف — روئے نگار یکطرف — حسنِ بہار یک طرف
مستِ جمال حق ہمہ — بیخود و بے رمق ہمہ — عقل زکار یکطرف — صبر و قرار یک طرف
نکہتِ لف چوں رسید — پردہ برد بے خود کشید — بادِ بہار یکطرف — مشک تتار یک طرف
باز ز قلبِ خستہ تن — برد شکیب و صبر من — زلف نگار یکطرف — چشم خمار یک طرف
یار پئے جفائے تو — ہر چہ بود فدائے تو — ایں دل زار یکطرف — جانِ فگار یک طرف
جلوہ طلعتِ ازل — تافتہ است بر محل — روئے نگار یکطرف — شکل بہار یک طرف
ایں دل بیقرار خود — مانند زکار و بار خود — ذوقِ خمار یکطرف — جلوہ یار یک طرف
در رہ عشق دمبدم — آفتِ جاں قدم قدم — ظلم نگار یکطرف — عشوہ یار یک طرف
درد بحالِ زار من — گریہ کناں بہ ہر زمن
ابرِ بہار یکطرف — شمع مزار یک طرف

"نظر" کا سالانہ نمبر

بڑی تقطیع کے پانچ جزو پر کم و بیش بیس عمدہ تصویروں کے ساتھ جنوری میں شایع ہوگا۔ غیر خریدار کو ۱۲؍ میں ایک کاپی ملیگی۔ منیجر "نظر" لکھنو

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو سے ہر قسم کا عطر مل سکتا ہے

خواب

(افسانہ)

شاہد کل صبح آٹھ بجے کی گاڑی سے "پرشوتم پور" جانیوالا تھا، آدھی رات گزر گئی تھی، نجمہ ابھی تک جاگ رہی تھی، اس کی آنکھوں میں نیند تھی اور نہ دل میں سونے کی خواہش، شاہد آرام سے سو رہا تھا، لیکن نجمہ اُس کے قریب لیٹی لیٹی اُسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

نجمہ کی شادی کو آج صرف پانچ دن ہوئے تھے چونکہ شاہد کو بہت جلد اپنی نوکری پر چلا جانا تھا، اس لئے شادی کی تمام رسمیں جلد جلد ختم کر دی گئی تھیں، شاہد کے جانیکے بعد نجمہ بھی اپنے میکے چلی جانیوالی تھی، شادی سے پہلے نجمہ نے شاہد کو دیکھا کیا اس کا کبھی نام بھی نہ سنا تھا، لیکن اللہ نے عقل اور والدین نے تعلیم دی تھی اس سے نجمہ اپنے انجان شوہر پر فدا ہونے کو پہلے ہی سے تیار بیٹھی تھی رسم و رواج کے مطابق ماں باپ نے نجمہ سے پوچھا بھی نہ تھا اور جانتی تھی کہ اُس کی شادی کہیں خاندان سے باہر ہونیوالی ہے، اسے اس کا بھی یقین تھا کہ ایسے اہم مسئلہ میں جس پر اس کی آئندہ زندگی کا سارا انحصار تھا، کوئی اُس سے پوچھیگا بھی نہیں، اس لئے نجمہ اپنا دل پہلے ہی سے شوہر کو نذر کر چکی تھی؛

نجمہ کے والد مولوی اظہار حسین نے اپنی بیٹی کی تعلیم میں بڑی کوشش کی تھی اسے کسی اسکول میں تو نہ بھیجا تھا، لیکن شفیق باپ نے خود جو کچھ معلوم تھا اپنی اکلوتی بیٹی کو پڑھا دیا تھا۔ اگر نجمہ، بی۔ اے باپ کی شاگرد تھی تو شاہد بھی کسی طرح کم نہ تھا امپریل کالج لندن سے اے۔ آر۔ اس۔ ام اور ڈی۔ آئی۔ سی کا ڈپلوما لیکر ہندوستان واپس آئے ہوئے ابھی صرف پندرہ مہینے گزرے تھے ایک سال سے شاہد کلکتہ کی مشہور کمپنی پرشوتم داس ٹھاکر داس کے بڑے آہنی کارخانہ میں تلاش معدن کا اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ تھا، تنخواہ بھی معقول تھی، بھتے کے علاوہ ساڑھے سات سو روپیہ ماہوار اور بہر ترقی کی امید، شاہد کے والد امیر تو نہ تھے مگر ہاں گھر کے خوش حال کھاتے پیتے لوگ تھے اور اصل تو یوں ہے کہ نہ تو مولوی اظہار حسین ہی کے پاس روپیہ تھا نہ عابد حسین کے پاس دونوں نے جو کچھ کمایا تھا بچوں کی تعلیم میں صرف کر دیا تھا، تھوڑی سی جائداد پر آرام سے سفید پوشی کے ساتھ بسر ہو رہی تھی۔

شاہد کو اپنی بیٹی دینے پر مولوی اظہار حسین کو شروع میں کچھ تامل ہوا تھا، کیونکہ اوّل تو شاہد کا وطن لطیف گنج روشن آباد سے بہت دور تھا۔ اکلوتی بیٹی کو اتنی دور بیاہ دینا مشکل سے دل گوارا کرتا تھا، اور دوسری بات شاہد کی نوکری تھی وہ معدن میں کام کرتا تھا اور اس لئے ہر وقت صحرائی جانوروں، درندوں اور حادثات کا ڈر تھا۔ اکثر اخباروں میں لوگوں کے ہلاک ہونے کی خبریں بھی آجاتی تھیں۔ آج آسام میں فلاں چائے کے کاشتکار انگریز کو شیر نے کھا ڈالا۔ کل فلاں افسر ہاتھی سے کچل گیا۔ پرسوں فلاں ریلوے انجینیر کو ریچھ نے نوچ ڈالا۔ اس لئے پہلے مولوی اظہار حسین کو کچھ تامل تھا، لیکن پھر قسمت پر بھروسہ کر کے راضی ہو گئے۔

نجمہ کو ان سب باتوں کی خبر تھی اور ان پانچ دنوں کی ملاقات اور ہزاروں رسموں سے فرصت پانیکے بعد جو کچھ گفتگو ہو سکی اُسی کے دوران میں شاہد نے

کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو کی ایک شاخ گلزار حوض حیدر آباد دکن میں بھی ہے

نجمہ کو اپنی پوری حالت، کام کے خطرے اور اُن کی مشکلات اور پھر نان و نمک کے لئے ایسے کاموں کی ضرورت سے اچھی طرح آگاہ کر دیا تھا، نجمہ لکھی پڑھی تھی سب سمجھ گئی اور اگر لکھی پڑھی نہ ہوتی تو میکے سے اتنی دور بیاہی کیوں جاتی۔

شب کے کھانے کے بعد نجمہ نے شاہد سے رکتے رکتے کہا کہ بیوی کا فرض ہے کہ وہ شوہر کی ہر مصیبتوں میں اس کے ساتھ رہے، ممکن ہے کہ صرف پانچ راتوں کی بیاہی نجمہ اپنا مطلب اچھی طرح نہ ظاہر کر سکی ہو لیکن شاہد نے اس کا مدعا سمجھ لیا اور مسکرا کر کہا "واہ! تم ساتھ رہو تو پھر کام ذرہ برابر بھی نہ ہو، میں مرد ہوں کبھی نہ کسی طرح جھیل لیتا ہوں لیکن جنگل میں اور تم! اور پھر یہ پردہ؟" نجمہ اس کا جواب کیا دیتی ہاں صرف اتنا کہہ سکی کہ "جنگل میں پردہ کی کیا ضرورت ہے" نجمہ یہ چند الفاظ مشکل سے ادا کر سکی، کیونکہ جی بھر آرہا تھا اور شاہد کے رنجور ہونے کے ڈر سے آنسو پی پی کر ضبط کر رہی تھی؛ اس کے بعد کچھ اور باتیں ہوئیں اور شاہد سو گیا۔ نجمہ البتہ جاگ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ شاہد کل نوکری پر جانیوالا ہے اور دس بارہ مہینے سے پہلے اُس کے واپس آنے کی امید بھی نہیں؛ نجمہ رہ رہ کر چاہتی تھی کہ شاہد سے لپٹ جائے اور خوب روئے لیکن جانے اجازت نہ دی پھر جنگل کے خطروں کا خیال آگیا اور نجمہ یہ سوچ کر کانپنے لگی لیکن پھر خود ہی اس طرح تسکین کر لی کہ واہ یہ کیا ضروری ہے کہ شاہد ہی کو نصیب دشمناں کچھ ہو جائے آخر اور لوگ بھی تو وہاں رہتے ہیں غرض یہی خیالات نجمہ کو سونے سے روک رہے تھے، کبھی محبت کی امنگ سے چہرہ گلنار ہو جاتا اور کبھی فرقت کی مصیبت سے آنکھیں ڈبڈبا جاتیں سینہ دھڑکنے لگتا دو بجے تک نجمہ اسی اُدھیڑ بُن میں پڑی رہی، یکایک شاہد نے کروٹ لی نیند میں تکیہ سیدھا کیا اور ایک ہات پھیلا کر سو رہا نجمہ نے اپنا سر شاہد کے بازو پر رکھدیا اور خود بھی سو گئی۔ - - - - - - - -

- -

نجمہ دیر سے شاہد کی راہ دیکھ رہی تھی، کبھی کان لگا کر سنتی، کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتی، کبھی گور کھا سپاہی کو بلا کر پوچھتی کہ صاحب کو آج اتنی دیر کیوں ہوئی دن کے دو بج گئے تھے آفتاب میں وہ حدت تھی کہ انسان کا دھوپ میں دو قدم چلنا محال تھا، شاہد صبح پانچ بجے سے جنگل کے اندر گیا ہوا تھا لیکن اب دو بجگئے تھے اور اس کا کہیں پتہ نہ تھا، شاہد کے ساتھ صرف چھ جنگلی اوڑا دن (چھوٹا ناگپور کی جنگلی قوم ([illegible]) تھے ایک رائفل اور پانی کی صراحی ساتھ تھی۔ جوار میں دو آدم خوار شیروں نے چند دنوں سے اودھم مچار کھی تھی۔ شب کے وقت خیموں کے ارد گرد اُن کی ڈکار سنی جاتی تھی۔

کچھ دیر تو نجمہ نے سوچا کہ شاہد کو شاید کسی معدن کا سراغ ملا ہوگا اور وہ آگے بڑھ گیا ہوگا، لیکن نجمہ شاہد کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھی سراغ ملتے ہی شاہد اُس کے پاس چلا آتا۔ اُس کی رائے لیتا، رسم و رواج اور خاندان والوں کے خلاف شوہر کی محبت میں نجمہ اُس کے ساتھ جنگل میں چلی آئی تھی اور اس محبت کے بدلے شاہد بھی اُسے صرف اپنی بیوی ہی نہیں بلکہ اپنا سچا دوست اور مشیر سمجھتا، ہر ہر بات میں اس سے رائے لیتا اور باہمی فیصلہ پر عمل کیا جاتا۔

بارہ بجنے کے بعد جوں جوں دن ڈھلتا گیا، نجمہ کی گھبراہٹ بڑھتی گئی۔ آخر نجمہ نے اپنے چوڑی دار پائجامہ پر موزہ پہنکر بوٹ پہن لئے، کمر سے پٹوا باندھ لیا، رائفل بھر لی، کارتوسوں کا ہار گلے میں ڈال لیا، گورکے سپاہیوں کو آواز دی، ان کی رائفل بھروائی، گگری بندھوائی، پانی کی چھاگلیں دو قلیوں کے حوالے کیں، کوٹ کے جیب میں دواؤں کی چند شیشیاں اور دو ایک پٹیاں رکھ لیں، اور جب سب تیاری ہو چکی تو انتشار

ہر قسم کا عطر اور خوردنی تمباکو اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگایے

کے ساتھ خیمہ کے اندر ٹہلنے لگی۔ خود نجمہ کو معلوم نہ تھا کہ آخر یہ تیاریاں اُس نے کس لئے کی نہیں، وہ بتا نہ سکتی تھی کہ آخر اُسے کس چیز کا ڈر تھا، لیکن دل کے اندر کوئی چیز کھٹک رہی تھی اور ضمیر کہہ رہا تھا کہ شاہد کہیں خطرے میں ہے۔

نجمہ کا انتشار بڑھ ہی رہا تھا کہ جنگل سے ایک اڑادن قلی چلاتا ہوا نکلا، قلی کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور اس کی ران سے خون جاری تھا، اپنی زبان میں وہ کہہ تو بہت کچھ گیا مگر نجمہ صرف اتنا سمجھ سکی کہ شاہد پر شیر نے حملہ کیا تھا اور ایک فیر کے بعد شیر نے جھپٹ کر شاہد کے ہاتھ سے رائفل گرا دی تھی۔ اس کے بعد نہ نجمہ نے کچھ سُنا اور نہ دماغ نے کچھ اور سوچنے کی مہلت دی، فوجی کمانڈر کی طرح کڑک کر نجمہ نے چاروں گورکھوں کو پکارا، سر پر شاہد کی ایک ٹوپی رکھ لی اور رائفل کاندھے پر رکھ کر خیمہ سے نکل کھڑی ہوئی۔ آگے دو گورکھے سنگین چڑھائے رائفل کاندھے پر رکھے بیچ میں نجمہ پیچھے پھر دو گرکھے اور ان کے بعد بارہ پندرہ اڑاون کمان اور بھالے سنبھالے جنگل میں گھس گئے، شاہد نے جاتے وقت جگہ جگہ پر درختوں کی ڈالیاں کٹوا دی تھیں جس سے اُسے راستے کا پتہ ملتا تھا، دھوپ سخت پڑ رہی تھی اور پیاس سے نجمہ کی زبان اینٹھی جا رہی تھی، پھر بھی وہ بھوکی شیرنی کی طرح ہر سو نگراں جلد جلد قدم بڑھاتی چلی جا رہی تھی نصف گھنٹہ چلنے کے بعد رہبر قلی ایک پہاڑی پر چڑھنے لگا، شوہر کی محبت میں نجمہ اگر جنگل میں نکل آئی تھی تو کیا، آخر پھر بھی ناز و نعم کی پلی ہوئی تھی؛ یہاں تک آتے آتے سانس چڑھ گئی تھی، پیاس سے بُرا حال تھا پاؤں شل ہو گئے تھے اور پہاڑی کی چڑھائی نے رہی سہی طاقت کھو دی تھی، چند قدم آگے چل کر نجمہ نے ٹھوکر کھائی، پتھر پر گر کر منہ ہات چورا ہو گیا ہوتا، لیکن وفادار گورکھے شاید اس کے لئے تیار تھے، ٹھوکر کھا کر نجمہ کا آگے جھکنا تھا کہ پیچھے کے گورکھے نے سنبھال لیا۔ نجمہ کے پاؤں میں سخت چوٹ آئی اور وہ دفعتاً غش کر گئی منہ پر پانی چھڑک کر نجمہ کو ہوش میں لائے۔ ہوش میں آتے ہی نجمہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور رن بہادر کا ہاتھ پکڑ کر بولی "رن بہادر، صاحب کی جان خطرے میں ہے" بوڑھا گورکھا کئی لڑائیوں میں لڑا ہوا تھا، مگر شریف عورت کی پکار سے اس کا دل بھی ہل گیا؛ اور وہ جانتا تھا کہ نجمہ اب ایک قدم بھی چلنے کے قابل نہ تھی، گورکھے نے جھک کر نجمہ کو اٹھا کر کاندھے پر ڈال لیا اور "آؤ بھائیو!" کہکر ساتھ والوں کو للکارتا ہوا پہاڑ پر چڑھنے لگا۔

گورکھے اور قلی جلد جلد پہاڑ پر چڑھ گئے، آگے والا قلی تھم گیا، ابھی تک راستہ کا پتہ تھا لیکن یہاں کے بعد کہیں درخت کٹا ہوا نہیں تھا، گورکھے اور قلی چاروں طرف پھیل کر شاہد کو ڈھونڈھنے لگے، رن بہادر بھی ایک ہاتھ سے نجمہ کو سنبھالے دوسرے ہاتھ میں رائفل لئے ادھر ادھر ڈھونڈھنے لگا دس منٹ کی تلاش کے بعد بھی شاہد کا کہیں پتہ نہ ملا۔ گھنے جنگل میں قدم قدم پر درندوں کا خوف تھا۔ شیر، ریچھ، سور، بکثرت تھے ہاتھی کے جھنڈ بھی کہیں قریب ہی رہا کرتے تھے، سانپ، بچھو کی انتہا نہ تھی، ان بڑے جانوروں کے علاوہ مچھر اور چھوٹی چھوٹی مکھیاں زندگی دوبھر کئے ہوئے تھیں اور اس پر طرہ یہ تھا کہ آفتاب آج گرم ہو رہا تھا، زمین جل رہی تھی، اور چونکہ درختوں کے پتے جھڑ گئے تھے اس لئے دھوپ سے کہیں بچاؤ نہ تھا رن بہادر اور اس کے ساتھ والے گو بہت سی لڑائیاں لڑے ہوئے تھے مگر اب ان کے بھی ہاتھ پاؤں نے بھی جواب دیدیا تھا کر دیا تھا، لیکن صرف اُن کی بہادری انھیں آگے لئے جا رہی تھی۔

شاہد کو ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے ایک بڑے چٹان کے قریب پہنچے تو شیر کی بو معلوم ہوئی، بوڑھا فوجی وہیں رک گیا، اور نجمہ کو کاندھے سے اتار کر بولا "بی بی یہاں کہیں شیر ہے، ڈرو نہیں، رائفل کا گھوڑا چڑھا لو اور آہستہ آہستہ چلو" نجمہ تھی کمزور مگر شاہد کی محبت اسے بہت بہادر بنائے

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر نہایت نفیس ملتا ہے

ہوئے تھی، ہاتھ میں رائفل سنبھالکر نجمہ رن بہادر کے ساتھ شکاریوں کی طرح ادھر اُدھر دیکھتی ہوئی آگے بڑہی، شیر کی بو بڑہ رہی تھی، چند قدم اور آگے چلکر رن بہادر نے نجمہ کی طرف دیکھکر لبوں پر انگلی رکھ لی، دونوں گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے، سامنے ایک شیرنی پڑی غرا رہی تھی، شیرنی کے پیٹھ سے خون جاری تھا، شاید وہیں گولی لگی تھی۔ نجمہ اور رن بہادر شیرنی سے نظر بچاتے ہوئے آہستہ آہستہ کھسک کر اُس طرف پہنچے جدہر پہاڑ ختم ہو گیا تھا، اور جہاں سے تین سو فٹ نیچے ندی بہتی تھی، جہاں نجمہ تھی، وہاں سے ندی تک اترنا بہت مشکل تھا۔ دریا کے کنارے، پتھر کے ڈھیلے اور چٹان پڑے تھے، پہاڑ کے نیچے شیروں اور ریچھوں کے بھٹ تھے، نجمہ نے دیکھا کہ شیرنی غرغرا کر پہاڑ کے دامن کی طرف بڑہ رہی ہے۔

لیکن زخمی ہونیکی وجہ سے بہت آہستہ آہستہ بڑہ رہی تھی، شیرنی سے کوئی چار گز کے فاصلہ پر ایک چٹان دریا کی طرف نکلی ہوئی تھی جس کا ایک کونہ پکڑے شاہد ندی کی طرف لٹک رہا تھا، شاہد کے شانوں سے خون بہہ رہا تھا اور قمیص پھٹی ہوئی تھی رائفل تھوڑی دور آگے پڑی تھی، شیر نے نال کو چبا ڈالا تھا۔ شیرنی رہ رہ کر غرا کر شاہد کی طرف بڑہتی تھی۔

معلوم نہیں کہ شاہد کتنی دیر سے اس طرح لٹک رہا تھا، اب اُس کی طاقت گھٹ رہی تھی ہات کانپ رہے تھے، شیرنی کے قریب پہنچنے کے معنی زندگی کا اختتام تھا۔ پہاڑ سے گرنا بھی موت کے منہ میں جانا تھا، دریا سے کچھ اوپر ایک بڑا شیر شاہد کے انتظار میں غرا غرا کر دم ٹپک رہا تھا۔ آن کی آن میں نجمہ سب حالت سمجھ گئی، دماغ کے کل پرزے فوراً کام کرنے لگے، نجمہ نے جھک کر رن بہادر کے کان میں کچھ کہا اور دونوں رائفل سنبھال کر الگ ہو گئے، دونوں نے بندوق سینے سے لگائی، نشانہ کیا، سانس روکی اور ساتھ ہی دو فیر ہوئے، زخمی شیرنی رن بہادر کی گولی کھاتے ہی ٹھنڈی ہو گئی اور نجمہ کی گولی سے پہاڑ کے نیچے کا شیر بھی ڈھیر ہو گیا۔ مگر یکایک بندوق کی آواز ہونے سے شاہد کا ہات چھٹا اور وہ دریا کے کنارے ایک چٹان پر گرا، نجمہ اپنی بدحواسی میں کسی طرح گرتی پڑتی شاہد کے قریب پہنچی، شاہد کا سر پھٹ گیا تھا اور اب ہچکی لے لیکر دم توڑ رہا تھا، نجمہ شاہد سے لپٹ کر دیوانہ وار چلانے لگی "شاہد، شاہد، پیارے شاہد! بولو! خدا کے لئے بولو، شاہد مجھے بھی ساتھ لے لو"، شاہد دم توڑ رہا تھا اور نجمہ اوسے پکار رہی تھی۔ -

- -

ایں کیا ہوا؟ نجمہ، نجمہ! چونکو!! ہشیار ہو، نجمہ، نجمہ، کیا نیند میں ڈر رہی ہو؟ چونکو!!!

نجمہ نے دیوانہ وار آنکھیں کھولیں، ادھر اُدھر دیکھا اور پھر شاہد سے چمٹ گئی۔ نجمہ دیر تک سسک سسک کر روتی رہی، آنسوؤں سے سارا چہرہ تر تھا، پسینہ سے بدن پر کپڑے چمٹ گئے تھے، نجمہ کا کلیجہ دھڑک رہا تھا۔ شاہد دیر تک اُس سے دلدہی اور پیار کی باتیں کرتا رہا، کچھ دیر کے بعد گلاس میں پانی لاکر نجمہ کو پلایا، تولیہ بھگو کر منہ پونچھا اور پھر خواب کی حالت پوچھی، نجمہ نے رک رک کر سب حالت بیان کی، شاہد نے کہا تم یہ خواب دیکھ رہی تھیں اور میں یہ خواب دیکھ رہا تھا کہ ایک پہاڑ کی چوٹی سے تیز روشنی پھیل رہی ہے اور میں تمہارا ہاتھ پکڑے ہوئے اس طرف چڑہ رہا ہوں"

شاہد و نجمہ جنگل میں مسرور زندگی بسر کر رہے ہیں اور اب انھیں نہ شیر کا ڈر ہے، اور نہ تنہائی کا خوف۔

سید علی اکبر کاظمی (بی۔ اے کنٹب)

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر ملتا ہے

ظہیر الدّین محمد بابر

(ولادت ۱۴۸۲ء وفات ۱۵۳۰ء)

تزک بابری ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے " میں بارھویں برس کی عمر اور رمضان المبارک[1] کے مہینہ میں فرغانہ[2] کا بادشاہ ہوا ، یہ ملک آبادی دنیا کے انتہائی حد پر پانچویں اقلیم میں واقع ہے اس کے مشرق میں کاشغر[3] اور مغرب میں سمرقند[4] واقع ہیں۔ فرغانہ کی مالگزاری ملک پر بغیر جبر کئے ہوئے تین چار ہزار سپاہ رکھنے کے لئے کفایت کرتی ہے یہ ملک وسعت میں کم ہے لیکن اس میں غلہ اور میوہ کثرت سے پیدا ہوتے ہیں " ان میں خربزہ نہایت پسندیدہ اور خاص پھل ہے ، چنانچہ مرتے وقت تک بابر نے اپنے وطن کا خربزہ یاد رکھا۔ فرغانہ اپنے یہاں کے ممتاز علماء دین اور شعرا کی وجہ سے جیسا کہ آگے چلکر ہم بیان کریں گے بہت مشہور تھا۔ فرغانہ منجملہ ان بیشمار چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے ایک ریاست تھی جن میں تیمور کی وفات کے بعد اس کے مقبوضات تقسیم ہو گئے تھے۔ یہ ریاست بابر کے باپ کے حصہ میں آئی تھی " جو ایک بلند حوصلہ شاہزادہ " پکا مسلمان ، علوم کا سرپرست ، خود شاعر اور شعرا کا دوست تھا ، اس کو فردوسی[5] کے مشہور شاہنامہ سے بہت دلچسپی تھی جس میں شجاعت کے کارنامے درج ہیں۔

یہ بادشاہ اپنے انصاف کی وجہ سے مشہور آفاق تھا۔ بابر اس کی منصف مزاجی کی ایک عجیب مثال لکھتا ہے۔ ایسے وقت میں جبکہ اسے خود بھی روپیہ پیسہ کی زیادہ ضرورت تھی شمالی چین کا ایک قافلہ اس کے پایہ تخت کے قریب برف میں تباہ ہو گیا۔ باوجود اپنی ضرورتوں کے اس نے سارا سامان تجارت نہایت احتیاط کے ساتھ رکھوا دیا تھا۔ یہاں تک کہ برس دو برس بعد ان سوداگروں کے ورثا اس کے شہر میں آئے اور اپنا اسباب بجنسہ اس کے ہاتھوں سے واپس پایا۔ بابر کہتا ہے کہ " اس کی فیاضی بہت بڑھی ہوئی تھی " اسی طرح پر اس کی روح تھی ، وہ نہایت نیک مزاج ، با مروت اور شیریں زبان تھا تاہم وہ دلیر اور اس کے ساتھ مردانہ تھا "

اس کے اتفاقیہ انتقال کر جانے پر بابر[6] اس کا بیٹا جو تیمور کی نسل میں چھٹویں پشت میں تھا تخت پر بیٹھا جس کی وجہ سے اسے اپنے مخالف بھائیوں سے

---

[1] روز پنجشنبہ پنجم رمضان ۸۹۹ھ ہجری

[2] ایشیائی روس میں واقع ہے خوکان صدر مقام ہے۔

[3] چینی ترکستان واقع وسط ایشیا کا خاص شہر آبادی سولہ ہزار

[4] روسی ترکستان کا ایک صوبہ۔ نہایت خوبصورت عمارات کے آثار اب تک موجود ہیں جن میں وسط ایشیا کی بہترین مسجد اور مقبرۂ تیمور قابل دید ہیں۔

[5] سلطان محمود غزنوی کے دربار کا مشہور آفاق شاعر جس کی رزمیہ تاریخ شاہنامہ کو ابن اثیر نے قرآن العجم لکھا ہے۔

[6] باپ کی طرف سے سلسلۂ نسب یہ ہے۔ ظہیر الدین محمد بابر بن عمر شیخ گورکان بن سلطان محمد سعید گورکان بن سلطان محمد میرزا بن میران شاہ میرزا بن امیر تیمور گورکان صاحبقران

کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو کا تار کا پتہ صرف " خا کافی ہے "

لڑنا پڑا اور بیرونی دشمنوں سے حفاظت کرنی پڑی۔ بابر کی ماں یونس خاں[۵۱] کی لڑکی تھی جس کا سلسلہ نسب براہ راست تیرہویں پشت میں چنگیز خاں تک پہنچتا ہے، بابر لکھتا ہے "وہ اکثر لڑائیوں اور مہمات میں وہ میرے ساتھ رہی ہے" بابر کی نانی صاحب الرائے اور ایک غیر معمولی اثر کی عورت تھی۔ "وہ بہت کم ایسی عورتیں تھی جو عقل اور سمجھ میں اُس سے بڑھکر تھیں" ان چھوٹی چھوٹی لڑائیوں میں جو بابر کے اوائل زمانہ میں ہوئیں یہ عورتیں اُس کی مشیر اور رہنما تھیں۔ اس کے تزک میں فرغانہ کی حفاظت یا سمرقند کی تسخیر کرنے میں سیکڑوں چھوٹی چھوٹی لڑائیاں، محاصرے، سازشیں، یورشیں، ہنگامے، فتح اور شکست مذکور ہیں کولمبس[۵۲] کے امریکہ دریافت کرنے سے قریب دو برس اور واسکوڈی گاما[۵۳] کے ہندوستان کے آنے سے چار برس قبل بابر تخت نشین ہوا۔ فرڈی نند[۵۴] اور ازابلا اسپین میں، ہنری ہفتم[۵۵] اور ہنری ہشتم[۵۶] انگلستان میں اس کے معاصرین تھے۔

بابر نے اپنی سرگزشت ترکی زبان میں اپنے ہاتھ سے لکھی ہے جو ہم تک بلا کسی تحریف کے پہنچی ہے، اس میں اس کی زندگی کی پوری تاریخ اس کی وفات سے ایک سال قبل تک کی درج ہے یہ ساری تاریخ نہایت راست بازی، سادگی دلچسپی اور مردانگی کے ساتھ لکھی گئی ہے، وہ لکھتا ہے کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے اس سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ کسی کے اوپر اس کا پرتو پڑے بلکہ میں نے یہ سب حالات صحیح اور صاف طور پر تحریر کر دیے ہیں اور میں نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے بالکل یہ مراد نہیں ہے کہ میں اپنی تعریف کروں، میں نے ہر ایک لفظ کو بہت جانچ اور صحت کے بعد لکھا ہے، اس لئے ناظرین مجھے معاف رکھیں"

---

۵۱ ماں کی طرف سے سلسلہ یوں ہے:۔ قتلغ نگار خانم بنت یونس خاں بن ویس خاں بن شیر علی دوغلن خاں بن محمد خاں بن خضر خواجہ خاں بن تغلق تیمور خاں بن عسان بغا خاں (ایسنبوغا) بن دوا یا دادا خاں بن براق خاں بن کارا عون (میسوں توا) بن متوکان (موتکان) بن چغتائی خاں، بن چنگیز خاں بن یسوگی بن برطان بن کابل بن طمنا بن بائیسنقر بن قیدو بن دوتومنن بن بقا بن بوذنجر خاں بن النقوا قرقلوق (عصمت مآب پاکدامن) النقوا کے متعلق ہم نے پہلے نوٹ دیا ہے۔ دیکھو حالات تیمور۔

۵۲ ولادت ۱۴۳۵ء وفات ۱۵۰۶ء وطن جنیوا، فرڈی نند اور ازابلا بادشاہ اور ملکہ اسپین کی سرپرستی میں ۱۴۹۲ء میں تین چھوٹے جہاز لیکر مغرب کی طرف جزائر، کنارے سے نامعلوم راستے پر جہاز ڈالدیے۔ جب خشکی نظر آئی تو اس نے خیال کیا کہ یہ مقام ہندوستان سے قریب ہوگا اسی لئے اس کا نام انڈیز رکھا جو اب تک مشہور ہے۔ صرف اس اندیشہ سے کہ ان جزائر کے باشندوں سے جو ہندوستان کے قریب واقع ہیں علیحدہ معلوم ہوں، وہاں کے باشندے ویسٹ انڈیز (مغرب کے ہندوستانی) کہلائے جاتے ہیں۔

۵۳ پرتگال کا مشہور بحری سیاح ولادت ۱۴۵۰ء وفات ۱۵۲۴ء ۱۴۹۷ء میں اس نے سفر شروع کیا اور مئی ۱۴۹۸ء میں کالیکٹ پہنچگیا۔ اس کے بعد کئی بار بادشاہ پرتگال نے سواحل افریقہ و ہندوستان پر نوآبادی قایم کرنیکی غرض سے روانہ کیا۔

۵۴ فرڈی نند ڈی کیتھولک، ولادت ۱۴۵۲ء وفات ۱۵۱۶ء ۱۴۹۷ء میں اُس نے سفر شروع کیا اور مئی ۱۴۹۸ء میں کالی کٹ پہنچگیا اس کے بعد کئی بار بادشاہ پرتگال نے سواحل افریقہ و ہندوستان سے جنگ کی اور ۱۴۹۲ء میں اس صوبہ کو فتح کرلیا۔

۵۵ ولادت ۱۴۵۶ء زمانہ حکومت ۱۴۸۵ء سے ۱۵۰۹ء تک ٹوڈر لائن کا بانی خاندانی لحاظ سے تخت سلطنت کا مستحق نہ تھا لیکن پارلیمنٹ نے اس کے دعوی کو تسلیم کرلیا۔ جو ازابتہ بنت اڈورڈ چہارم کے ساتھ شادی ہونے سے اور مضبوط ہوگیا تھا۔

۵۶ ولادت ۱۴۹۱ء زمانہ حکومت ۱۵۰۹ء سے ۱۵۴۷ء تک۔ ہنری ہفتم کا دوسرا بیٹا تھا، شروع زمانہ حکومت میں پوپ لیو دہم نے محافظ دین کا خطاب عطا کیا اس لئے کہ اُس نے لوتھر کے خلاف ایک کتاب لکھی تھی۔

مشکی زردہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگانا چاہیے۔

بابر کے باپ کو سمرقند کے فتح کرنیکا بڑا حوصلہ تھا جو سلطنت تیمور کا قدیم دار الحکومت تھا اور بابر نے اس کی یہ خواہش پوری کی۔ تیمور کی حیات میں پایہ تخت کی حکومت اس کے ایک بیٹے اور ایک پوتے کو تفویض ہوئی تھی۔ اس کی وفات کے بعد اس کے چھوٹے بیٹے شاہرخ میرزا والی خراسان نے اس شہر پر قبضہ حاصل کیا اور اپنے بیٹے الغ بیگ میرزا مشہور ہیئت دان کے حوالہ کر دیا تھا۔ بابر کہتا ہے کہ اس کے ہاتھ سے اس کے بیٹے عبداللطیف میرزا نے سمرقند کو نکال لیا جس نے اس بے ثبات دنیا کی محبت میں اپنے سن رسیدہ باپ کو جو علم و فضل میں ایسا ممتاز تھا قتل کر ڈالا [ف۱]

الغ بیگ بحر علوم و خرد   که دنیا و دین را از و بود پشت
ز عباس شہد شہادت چشید   شدش حرف تاریخ عباس کشت

تاہم دیہیم شاہی پانچ یا چھ مہینہ سے زیادہ اس کے سر پر قایم نہ رہا [ف۲]

پدر کش بادشاہی را نشاید   اگر شاید بجز شش مہ نپاید   (یہ خاص بابر کا شعر ہے)

عبدالطیف میرزا کے بعد عبداللہ میرزا تخت نشین ہوا اور تخمیناً دو برس سلطنت کی جس کے بعد سلطان ابوسعید مرزا نے سلطنت پر قبضہ کیا اور اس نے اپنے بڑے بیٹے سلطان احمد مرزا کے سپرد کر دیا اس کے انتقال پر (۱۴۹۴ء) سلطان محمد میرزا تخت نشین ہوا اور اس کے بعد بایسنغر میرزا حاکم ہوا۔

ف۱ مرزا حیدر تاریخ رشیدی میں لکھتے ہیں کہ الغ بیگ کی صحیح تاریخ معلوم نہیں ہے البتہ اس نے ۸۱۲ھ یا ۱۴۰۹ء میں کوئی ۴۰ برس اپنے باپ شاہ رخ میرزا کے وفات سے قبل سمرقند میں حکومت کا آغاز کیا تھا، شاہرخ میرزا امیر تیمور کا چوتھا بیٹا تھا۔ شاہرخ کی وفات پر جو ۸۵۰ھ (۱۴۴۶ - ۴۷ء) میں ہوئی الغ بیگ تخت نشین ہوا جس نے ڈھائی سال تک اور سلطنت کی۔ ان جھگڑوں اور فسادات میں جو شاہرخ کی وفات کے بعد پیدا ہوئے الغ بیگ کو اس کے بیٹے عبداللطیف (رمضان ۸۵۳ھ یا ۲۷ اکتوبر ۱۴۴۹ء) نے گرفتار کر کے قتل کیا اور اس لئے اس کی تاریخ وفات کی نسبت میرزا حیدر کا اندازہ صحیح معلوم ہوتا ہے الغ بیگ علم ہیات کے نقشوں کا موجد ہے اُن کو ترتیب بھی دیا ہے۔ گریوز صاحب نے انگلستان میں ۱۶۵۰ء میں پہلی مرتبہ ان نقشوں کو شائع کیا جو جغرافیہ کے متعلق ہے اور آکسفورڈ کے ہائیڈ صاحب نے ثوابت کے متعلق نقشے ۱۶۶۵ء میں شایع کئے اسی طرح فرانس میں لالنڈی نے علم ہیات کے متعلق نقشے ۱۷۹۲ء میں شایع کئے۔ الغ بیگ بادشاہ اور ہیئت دان دونوں تھا۔ اس کے آلات رصد بہتر اور بہت سے۔ رصد خانہ کا ربع دائرہ اس قدر بلند تھا کہ اس کا نصف قطر قسطنطنیہ کی جامع مسجد اباصوفیا کے برابر تھا۔ اس کی برباد شدہ عمارت بابر کے زمانہ تک موجود تھی بابر کے الفاظ سمرقند کی عمارات کے سلسلہ میں یہ ہیں "در سمرقند یک عمارت دیگر در دامنۂ پشتہ کوہک رصد است کہ آلۂ زیج نوشتن است۔ سہ اشیانہ است۔ الغ بیگ میرزا باین رصد زیج گورگانی را نوشتہ کہ در عالم حالا این زیج معمول است و بہ زیج دیگر عمل کم کنند" اس رصد کے بعض تحقیقات یہ ہیں (۱) قمری مہینہ کی مقدار زمانہ ۲۹ درجہ ۳۱ دقیقہ ۵۰ ثانیہ ۸ ثالثہ ۹ رابعہ ۲۰ خامسہ ہے۔ (۲) عطارد کی غایت تعدیل ۲۲ درجہ ۲۶ دقیقہ ۳ ثانیہ ہے (۳) میل کلی جو بارہ بالا قطاب الاربعہ کی ایک قوس کا نام ہے ۲۳ درجہ ۳۰ دقیقہ ۷ ثانیہ ہے (۴) منجمان فارس دنیا کی ابتدائی آبادی جزائر خالدات سے اور منجمان ہند لنگ ڈز سے شروع کرتے تھے۔ الغ بیگ نے زمین کردی ہونیکی وجہ سے ابتدائی آبادی ہر جگہ فرض کیا جاسکتا قرار دیا۔ شہر سمرقند کی قریب مسٹر اسکاٹ لیر کو ایک پہاڑ چوپان اتا دکھایا گیا تھا جس کی بابتہ خیال تھا کہ الغ بیگ کا رصد خانہ تھا۔ اب اس کا کوئی نشان باقی نہیں ہے۔

ف۲ یہ مشہور قصہ ہے کہ الغ بیگ نے جب ستاروں کی چال سے یہ معلوم کر لیا کہ وہ اپنے بیٹے کے ہات سے قتل ہو گا تو اس نے بیٹے کے ساتھ نہایت درجہ کی بدسلوکی شروع کر دی۔ جس کی وجہ سے وہ باغی ہو گیا، لیکن بابر کی رائے اس واقعہ کے متعلق صاف طور پر مختلف ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بابر ضرور واقف تھا (دیمبری صاحب کی تاریخ بخارا باب دوازدہم بھی دیکھو) مؤلف

ہر قسم کے عطر کا مخزن کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو

میں نے بایسنغر مرزا سے فتح کیا جو واقعات کہ بعد کو پیش آئے وہ مناسب موقع پر اس سرگزشت میں بیان کئے جائیں گے۔"
بابر کی تخت نشینی سے ہم کو صاف معلوم ہوتا ہے کہ بابر کی زندگی کا بڑا زمانہ نہایت بے اطمینانی سے گزرا ہے۔ ایک اور دوسری عجیب مثال اس امر کی پیش کی جاسکتی ہے۔ اس کی پانچ بہنیں تھیں جن میں سے دو بہنوں کو دشمنوں نے لڑائی میں قید کر کے حرم میں داخل کر لیا تھا۔[۵۱] یہ بادشاہوں کی بیٹیاں اور بہنیں تھیں۔
بابر نے اپنی سرگزشت میں ترکی سرداروں کے نام اور حصائل تحریر کئے ہیں جنھوں نے ہمیشہ بابر کی حمایت کی ہے۔ اس کے اس صاف گوئی سے ہم کو خود بابر اور نیز ان اراکین کے اخلاق و عادات سے واقفیت ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک خوش مزاج، سیدھا سادھا وضع کا آدمی تھا جو میلوشی کے جلسوں میں گانے میں سب پر فوق لیجاتا تھا" دوسرا "ایک مقدس دیندار اور سچا مسلمان تھا جو غیر معمولی طور پر صائب الرائے اور ذی فہم تھا۔ وہ بہت ہی خوش طبع تھا اور باوجودیکہ ان پڑھ تھا پھر بھی بہ لحاظ صفت ظرافت نہایت طباع تھا" "ایک اور میر علی دوست میری نانی کے رشتہ داروں میں سے تھے۔ میں ان کے ساتھ بہت مہربانی سے پیش آتا تھا۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ یہ ایک کارآمد شخص ثابت ہوں گے، لیکن سال بھر سے جب تک وہ میرے ساتھ رہے ہیں میں نہیں کہہ سکتا کہ کونسی خدمت انھوں نے انجام دی" "چوتھا ابراہیم بیگ تھا، یہ شخص شجاع، سیدھا اور ایماندار تھا، اس کا ایک بیٹا اب تک میرے ساتھ ہے یہ لڑکا سست کاہل اور بالکل نکما آدمی ہے۔ خدا کی شان ایسوں کے ایسے ہوں!"
اس طرح پر بابر اپنے امرا اور ساتھیوں کے نام شمار کراتا اور ان کے اوصاف کا موازنہ کرتا ہے جیسا کہ شہنشاہ مرقس[۵۲] آرولس نے اپنے رفقا کے چال چلن کا حال بیان کیا ہے ذیل میں چند دیگر مثیلات بیان کی جاتی ہیں جو غالباً کافی ہونگی۔
علی شیر بیگ درحقیقت ایک بہتیں آدمی تھا۔ جب سے کہ ہماری زبان میں نظم پہلے لکھی گئی ہے، کسی شخص نے اتنا اور ایسا اچھا نہیں لکھا اس نے عمدہ عمدہ نغمے اپنی تصنیف میں چھوڑے ہیں جو دھن اور تان دونوں کے لحاظ سے بے نظیر ہیں ہماری تاریخ میں کسی ایسے آدمی کا نام نہیں ملتا جو ہنرمندوں اور ذی علم لوگوں کا اس سے زیادہ مربی اور سرپرست رہا ہو"
مطرب مصور اور شعرا سب ہی قسم کے لوگوں کی سرپرستی کرتا تھا، اس میں یہ ایک خصوصیت تھی کہ اس کے بی بی بچے کوئی نہ تھے "اس نے اس عالم میں نہایت بےفکری اور آزادی سے بسر کی" وہ ملکی معاملات سے علیحدہ رہتا تھا اور اپنا وقت تحصیل علم اور تصنیف میں صرف کرتا تھا یہ اس کا مقولہ ہے "اے لوگو! تم کہتے ہو کہ یزید پر لعنت مت بھیجو کہ مبادا خدا اس پر رحم فرمائے، لیکن میں کہتا ہوں کہ خدا اس کی بدسلوکیوں اور مظالم کو جو اس نے آل رسولؐ پر کئے ہیں سب کے سب معاف کر دے تو وہ انھیں بھی معاف کر دیگا جنھوں نے اس پر لعنت بھیجی ہوگی۔"

۵۱ ابوالفضل لکھتا ہے، خانزادہ بیگم ہمشیرہ عینی حضرت گیتی ستانی فردوس مکانی پنج سال از ایشاں کلاں بودند دراں ہنگام کہ شاہ اسمٰعیل صفوی اوزبک را در مرو زیر کرد آں پردہ نشین محفۂ عفت در مرو بودند شاہ اسمٰعیل احترام نمود و باعزاز بسیار در قندز پیش حضرت گیتی ستان فردوس مکانی فرستاد (اکبرنامہ)

۵۲ ولادت ۱۲۱ء وفات ۱۸۰ء انٹونی نس پوس شہنشاہ روم نے متبنیٰ کیا تھا ۱۶۳ء میں اس کا جانشین ہوا، بہت بڑا حکیم اور اسٹوئیک اسکول کا زبردست فلاسفر تھا، اس کی تصنیفات میڈیٹیشن (تخیلات) کا ترجمہ بہت سی زبانوں میں ہو چکا ہے اور اب بھی کثرت کے ساتھ مطالعہ کی جاتی ہیں باوجود اس امر کے کہ اس نے عیسائیوں کے حق میں سخت مصائب نازل کر دیے اس کا شمار روما الکبریٰ کے بہترین شہنشاہوں میں ہوتا ہے۔

ہر قسم کی خوردنی تمباکو منگانیکا پتہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو

"دوسرا شیخم بیگ تھا۔ اُس نے ایک قسم کے اشعار ایسے کہے ہیں جن میں الفاظ اور مطلب دونوں خوف ڈالنے والے ہیں اور ایک دوسرے سے مطابق ہیں ذیل کا شعر اُسی کا ہے ۵۰

"شب غم گرد باآہم ز جا برد گردوں را   فرو برد اژدہائے سیل اشکم ربع مسکوں را"

جب اُس نے ان اشعار کو دوبارہ پڑھا تو مُلّا نے اُس سے کہا "تم نظم پڑھ رہے ہو یا لوگوں کو خوف زدہ کر رہے ہو؟" ۵۱

فرغانہ میں شرع کا جو سب سے بڑا عالم تھا اُسے دشمنوں نے قتل کر ڈالا۔ اس کی نسبت بابر جو خود بھی بڑا شجاع اور جوانمرد تھا کہتا ہے "بلاشک میرے نزدیک وہ ولی کامل تھا۔ اس کی ولایت کا اس سے بڑھکر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ تھوڑے ہی دنوں بعد اُس کے سارے دشمن ہلاک ہو گئے؟ وہ ایک بڑا بیباک شخص تھا جو اُس کے تقدس کا کوئی کم ثبوت نہیں ہے۔ ہر آدمی خواہ وہ کتنا ہی بہادر کیوں نہو کچھ نہ کچھ تردد یا خوف میں مبتلا رہتا ہے، وہ دونوں باتوں سے بالکل مبرّا تھا" ۵۲

---

۵۱ میں یہاں عبد الرزاق کی ایک مختصر نظم جو ایشیائی مبالغہ کی ایک دوسری مثال ہے بغیر انتخاب کئے نہیں رہ سکتا۔ وہ مئی سنہ ۱۴۴۲ء میں خلیج فارس کے کنارہ پر موجود تھا۔ وہاں کی شدتِ گرمی کا حال یوں بیان کرتا ہے:۔

(ترجمہ) جوں ہی کہ آفتاب افق سے طلوع ہوا پتھر کا جگر اس کی شعاعوں سے کھولنے لگا،
انہیں شعاعوں نے افق کو ایسا جھلسایا۔ کہ پتھر کا جگر جلکر موم ہو گیا،
پانی کی تہ میں مچھلیوں کے جسم مثل ایسے ریشم کے جلنے لگے جو آگ دکھلائے جاتے ہوں،
پانی اور ہوا دونوں کی حدت اس حد تک تھی کہ مچھلیاں آگ میں پناہ لینے کو چلی آئیں،
میدانوں میں شکار کھیلنا نہایت آسان ہو گیا تھا، کیونکہ صید گاہ یا جنگل بھنے ہوئے غزالوں سے اٹا ہوا تھا۔ (مولف)

۵۲ بابر کی صحبت میں جن اجلّۂ روزگار اور ارباب کمال کو تقرب حاصل تھا۔ اُن میں ایک میر ابوالبقا تھے جو علم و حکمت میں بلند پایہ رکھتے تھے۔ دوسرے شیخ زین صدر نبیرہ شیخ زین الدین خوافی بڑے تیز طبع تھے فن انشا و شاعری میں کمال حاصل تھا۔ ہمیشہ بابر کی صحبت میں رہا کئے، ہمایوں کے عہد میں امارت کے درجہ تک پہنچے۔ ابوالفضل نے لکھا ہے "شیخ زین صدر وقتیکہ بملازمت رسید پرسید ند کہ عمرت چند است؟ شیخ گفت بیش ازیں ہفت سال چہل سالہ بودم و قبل ازیں بدو سال چہل سال داشتم واکنوں نیز چہل دارم، بادشاہ بے تامل مقصود شیخ دریافت و تحسین فرمود"

زین خاں نے تزک بابری کا ترجمہ کیا تھا اُن کے علاوہ یہ اصحاب تھے۔

شیخ ابوالوجد فارغی خال شیخ زین خوش صحبت و خوش طبع تھے، شعر بھی موزوں کر لیتے تھے۔ سلطان محمد کوسہ اُن کے داڑھی میں بال نہ تھے اس لئے کوسہ کہلائے جاتے تھے۔ طبع لطیف پائی تھی، بڑے سخن شناس تھے مولانا شہاب معمائی حقیری تخلص کرتے تھے بڑے ذی علم و فضل تھے شاعری میں دستگاہ حاصل تھی۔

مولانا یوسفی طبیب خراسانی بڑی صنعت کے بزرگ تھے سرخ وداعی فارسی اور ترکی دونوں زبانوں میں اشعار کہتے تھے۔

ملا بقائی کو شاعری میں اچھا سلیقہ حاصل تھا۔ مخزن الاسرار نظامی کی بحر میں بابر کے نام منسوب کی تھی۔

خواجہ نظام الدین علی خلیفہ، فراست و تدبر کی وجہ سے خاص مرتبہ حاصل تھا، فن طب میں خاص بہرہ رکھتے تھے

میر درویش محمد ساربان ناظر الدین خواجہ احرار کے مرید خاص تھے، خوش صحبتی و فضیلت میں ممتاز تھے، بادشاہ اُن کا بڑا اعتبار کرتے تھے۔

خواندمیر، فاضل مورخ بڑا خوش صحبت تھا، تاریخ حبیب السیر خلاصۃ الاخبار و دستور الوزرا خاص تصانیف ہیں۔

خواجہ کلاں بیگ، امرائی بزرگ و اہل صحبت میں سے تھا۔ سنجیدگی اطوار و شائستگی فضائل میں ممتاز تھا اس کا بھائی معتمد خاص و مہر دار تھا۔

بابر جو خسرو شاہ سے سخت نفرت رکھتا تھا اُس کی نسبت لکھتا ہے " اس بیوفا اور ناپائیدار دنیا کی طمع سے جو نہ کبھی کسی کی ہوئی اور نہ ہو گی اس احسان فراموش اور ناشکر گزار نے سلطان کو جس نے بچپن سے سن بلوغ تک خود پرورش کی اور اُسے لکھایا پڑھایا تھا گرفتار کرکے نشتر سے اندھا کر دیا۔ قیامت کے دن تک ہر روز ہزاروں اور لاکھوں لعنت اس کی گردن پر ہو جو ایسی مذموم دغابازی کا مرتکب ہوا ہے جو شخص خسرو شاہ کے اس فعل کو سُنے اس پر لازم ہے کہ لعنت بھیجے، کیونکہ جو شخص اس قسم کے افعال قبیحہ کو سُنے اور لعنت نہ بھیجے خود اس قابل ہے کہ اس پر لعنت بھیجی جائے "

علی شیر کے اشعار نے اس قسم کے فقرہ کا مضمون سوجھایا ہو گا۔

اس قسم کے سردار تھے جو بابر کے دربار میں جمع تھے۔ جن کے ذریعہ سے اور جن کے خلاف اُس کو کام کرنا پڑتا تھا۔ ان کے ساتھی بہادر مگر غیر مستقل مزاج تھے اُن کے شہر والوں نے بابر کی آوارہ گرد فوج کا جس میں بعض اوقات دو سو سپاہیوں سے بھی زیادہ نہ رہتے تھے، کبھی تو خیر مقدم کیا، کبھی اُن کو مردود کر دیا۔

بابر نے فن جنگ بے قاعدہ طور پر سیکھا تھا لیکن جو کچھ بھی سیکھا تھا نہایت مکمل طور پر۔ ایک موقع پر اُس کے سپاہیوں نے زبردستی بہت سامال لوٹ لیا جسے بابر نے واپس دلایا کہتا ہے میری فوج قاعدہ کی ایسی پابند تھی کہ کل مال غنیمت بلا استثنا، واپس کر دیا گیا۔ اور دوسرے دن پہلی بار جائزہ لینے سے قبل ایک تاگے کا ٹکڑا یا ٹوٹی ہوئی سوئی تک باقی نہ رہگئی ہے۔ جو مالکان کو واپس نہ دیدی گئی ہو" بابر اُن پہلے حکمرانوں میں ہے جنہوں نے بجائے مختلف جرگوں اور گروہوں کے دیوانہ وار حملہ کرنے کے فوج کی تقسیم کرکے رسالوں کی یکجا یورش کرنیکا قاعدہ جاری کیا۔ سمرقند جسے بابر بہت عزیز رکھتا تھا تین بار قبضہ میں آیا اور نکل گیا۔ لیکن وہ وہاں کی عمارات کی بار بار تعریف کرنے سے کبھی نہیں تھکتا۔ کہتا ہے:-

" تمامی آباد حصۂ دنیا میں چند ہی شہر اس خوبصورتی کے ساتھ واقع ہوں گے " بابر کے حکم سے اُس کی شہر پناہ کی پیمائش کی گئی جس کا دَوْر پانچ میل بحساب انگریزی نکلا " بابر اُس کا عرض البلد ۳۹ درجہ ۳۷ دقیقہ اور طول البلد ۹۹ درجہ ۱۶ دقیقہ بیان کرتا ہے " یہ حساب اُلغ بیگ کے نقشہ جات کے مطابق ہے جس نے طول البلد کا شمار مقام فیرو[1] سے کیا ہے، اُلغ بیگ (۱۳۹۳-۱۴۴۹) کا نام بمقابلہ بادشاہوں کے سائنس داں ہونے کی حیثیت سے مشہور ہونے کے لئے زیادہ موزوں تھا۔ اس کا تین برس کا مختصر زمانہ حکومت متواتر ناکامیوں اور مصائب میں گزرا لیکن اس کی شہرت بحیثیت مہندس اور ہیئت داں ہونے کے لازوال ہے۔

اسکندریہ کے یونانی مدرسوں کے بعد سے سلسلہ دار بغداد، قرطبہ[2]، سیوائل[3]، طنجہ[4] اور سمرقند دار العلوم رہے ہیں اور ۱۵۷۶ء یعنی ٹیکو[5] کے زمانے

([illegible] (مولف)

[1] یہ جزیرہ افریقہ کے شمالی و مغربی سمت جزائر کنارے میں واقع ہے۔

[2] جنوبی اسپین کا ایک شہر دریائی گواڈلکور کے کنارے واقع ہے یہاں نہایت خوبصورت چوک اور ایک عالی شان گرجا بنا ہے، جو پہلے مورون کی مسجد تھی۔ مورون کے عہد میں قرطبہ صدر مقام تھا۔

[3] مراقش کا خاص بندرگاہ۔

[4] یہ بات دلچسپی کے ساتھ سنی جائیگی کہ ترکستان کے جدید فرمانروایان (روسیوں) نے سمرقند میں رصدگاہ قایم ہونے سے ۴ ½ صدی بعد ایک دوسری رصدگاہ بنائی ہے

[5] ٹیکو براہی۔ ولادت ۱۵۴۶ء وفات ۱۶۰۱ء ہالینڈ کا سربرآوردہ و ممتاز ہیئت داں ۲۰ برس تک جزیرہ ہوئن کے رصدخانہ تعمیر کردہ بادشاہ فریڈرک میں نہایت غور و خوض کے ساتھ ستاروں کی چال کا مشاہدہ کرتا رہا۔ ۱۵۸۰ء میں اور نبرگ (ڈنمارک) میں رصدخانہ قایم کیا۔ اُس کے بعد پھر برابر رصدخانہ قایم ہوتے رہے۔

مغربی اقوام میں علم و فن نے جنم لیا۔ الغ بیگ فلسفہ عربی کا آخری استاد تھا۔ ٹیکو سے ایک سو پچاس برس قبل الغ بیگ نے رصد کے متعلق بڑے بڑے آلات تیار کئے اور قریب ایک سو نجموں اور مہندسوں کی مدد سے اُس نے اپنے مشہور نقشے جات تیار کئے جن میں سیاروں کی حرکت اور ستاروں کی فہرست درج ہے۔

بابر کا بیان ہے کہ الغ بیگ کی رصدگاہ کوہ کالک کے دامن میں سہ منزلہ بنائی گئی تھی۔ دنیا بھر میں سات یا آٹھ[1] رصدگاہوں سے زیادہ نہیں بنائی گئیں ان میں سے ایک خلیفہ مامون الرشید دوسری بطلیموس[2] نے بمقام اسکندریہ بنایا تھا، "کابل حمام اور مساجد ہر تعریف و توصیف کے لائق تھیں یہاں تک کہ نانبائیوں کی دوکانیں بھی نہایت عمدہ تھیں اور طباخ نہایت ہوشیار تھے" سمرقند کی سڑکیں پختہ کردی گئی تھیں اور نلوں کے ذریعہ سے پانی تمام شہر میں پہنچایا جاتا تھا۔ اس جگہ بابر نے مکرر سمرقند کے نفیس خربزہ اور اُس کے ماتحت شہر بخارا کی شراب کی تعریف کی ہے۔ سمرقند میں جبکہ شراب کا دور چلتا اور میں شراب پیتا تو صرف بخارا کی شراب استعمال کرتا تھا۔ "یہاں کے لوگ صاحب علم و فضل تھے اور شاعروں کی نہایت مہمان نوازی کرتے تھے، یہیں بابر نے فن شاعری کو حاصل کیا اور اُس میں کچھ کم کمال نہیں پیدا کیا۔ اس شہر میں بہت سی عالی شان عمارتیں مساجد، دارالعلوم اور محلات تھے جنکی تعمیر میں تیمور نے خود صناعوں کی رہنمائی کی تھی یہ عمارت پچے کاری، میناکاری اور تصویروں سے آراستہ تھیں[3]۔ دارالعلوم علما اور طلباء سے بھرے ہوئے تھے اور شاہی دربار میں شعرا اور مصوروں کا مجمع رہتا تھا۔ یہ زمانہ ترکی تعلیم کی بہار کا تھا جس میں جہالت کی درمیان سے شگوفے نکل رہے تھے، مگر خواص میں سے بھی ہر متنفس خواندہ نہ تھا اور اس لئے حافظہ اعلیٰ درجہ کی قوت پا رہا تھا، جیساکہ اُن میں سے ایک نے کہا تھا "جب ایک شخص نے ایک مرتبہ کوئی بات سن لی تو وہ اُسے کیونکر بھول سکتا ہے؟" ہلالی شاعر کا حافظہ ایسا قوی تھا کہ تیس یا چالیس ہزار ابیات اُسے زبانی یاد تھے، اگرچہ قوت حافظہ کے یہ اوصاف ہم زمانہ حال کے لوگوں کے نزدیک غیر معتبر خیال کئے جاتے ہیں جو روایت پر بہ نسبت سماعت کے زیادہ مدار رکھتے ہیں، تاہم بلا شبہ یہ امور صحیح طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ رگ وید میں دس ہزار سے کچھ زیادہ ہی اشلوک ہیں اور دو ہزار برس سے زیادہ عرصہ تک اُس کا تحفظ محض زبانی یادداشت پر مبنی تھا اور ایک نہیں بلکہ ہزار ہا برہمن لفظ بہ لفظ اُسے زبانی پڑھ سکتا تھا۔ (باقی)

سید عبدالسبحان ناظر

---

[1] سب سے قدیم رصدخانہ فلون نے ۴۳۲ سال قبل مسیح قایم کیا اور اوّل اوّل مدار صیفی کا تعین اُسی میں کیا گیا اور آلہ ہیلیوٹیر (قائمہ) کا استعمال ہوا۔ پھر تیمور فارس، منالاوس، ابرخس نے رصد خانے قایم کئے مسلمانوں سے پہلے کا نہایت مشہور رصدخانہ وہ تھا جس کا مہتمم بطلیموس تھا جس نے ایک منتظم رصدخانہ کی بنیاد ڈالی۔ ضروری آلات ایجاد کئے اور برخلاف فیثاغورث زمین کو کائنات کا مرکز قرار دیا۔ [2] دوسری صدی کے اوائل میں پیدا ہوا اور ۷۸ برس کی عمر پا کر ۱۶۹ء میں انتقال کیا۔ اصل میں یونانی تھا اور اسکندریہ چلا آیا تھا۔ حکیم جالینوس کا شاگرد اور نہایت مشہور جغرافیہ و ہیئت داں جس کے نقشوں پر پندرھویں صدی تک عملدرآمد ہوتا رہا، جبکہ کولمبس نے امریکہ دریافت کیا تھا۔ اس نے زمین کو ساکن اور مرکز کائنات مانا تھا جسکے گرد ثوابت و سیارے چکر لگاتے ہیں ۱۵۴۳ء میں کوپرنکس نے جب اپنے مسائل پیش کئے تو یہ اصول غلط ٹھہرائے گئے اُس نے متقدمین علماء ہیئت خصوصاً ہپارکس (ابرخس) کے سیاروں اور ثوابت کی فہرستوں کی تصحیح کی اور ایسی جدولیں بنائیں جن سے سورج و چاند وغیرہ کی گردش کا حساب لگ سکتا ہے۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے اصطرلاب وغیرہ آلات رصد ایجاد کئے۔ کتاب مجسطی اس کی بیش بہا تصنیف ہے نامور مسلمان علماء ہیئت فضل بن یحییٰ تبریزی و محمد بن جابر و ابوریحان خوارزمی اس کی فضیلت کے معترف ہیں۔ یحییٰ بن خالد برمکی وزیر خلیفہ ہارون الرشید عباسی کے حکم سے اس کتاب کے تیرہ مقالوں کا ترجمہ یونانی سے عربی زبان میں کیا گیا۔ فن جغرافیہ میں اسکی کتاب کا عربی ترجمہ کندی نے کیا تھا۔ علم موسیقی میں بھی ایک کتاب تین جلدوں میں لکھی۔

[3] اچھے مسلمانوں کے نزدیک یہ راسخ الاعتقادی نہ تھی، پیغمبر اسلام فرماتے ہیں "جس گھر میں کتا یا تصویر ہو انہیں فرشتے داخل نہیں ہوتے" اور دوسرے موقع پر اس سے بھی زیادہ اعتقاد کے ساتھ بیان فرمایا ہے "ہر مصور ناری ہے" یہودیوں کی طرح مسلمان بھی مصوری اور بت تراشی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، لیکن وہ صناعی اور معماری کی خوبیوں کے بہت جلد دلدادہ ہو گئے۔ بابر کے بعد سے سمرقند میں علم و ہنر کو تیزی کے ساتھ تنزل ہونے لگا۔ اور سترھویں صدی تک یہ تنزل برابر ہوتا رہا جب سے شہر کی ترقی رک گئی اور پھر وہ ایک حالت پر قایم ہو گیا ۱۸۶۸ء میں ۱۴ مئی کو روسیوں نے اس شہر پر قبضہ حاصل کیا اور ممکن ہے کہ اب بیسویں صدی میں ترکستانی کالجوں میں علم و ہنر کی از سر نو بنیاد قایم ہو (مولف)

ہمشیر مرحومہ کی یاد میں

ایک حیرت ہے بزمِ امکاں میں — کس قدر طاقتیں ہیں انساں میں
دوڑتا ہے فضائے گردوں میں — کود جاتا ہے نیل و جیحوں میں
ذرہ عرش تک رسائی ہے — ہر ستارے سے آشنائی ہے
آسمانوں کو دیکھ بھال لیا — خونِ رگ مہر سے نکال لیا
بھر لئے آستیں میں شمس و قمر — چھین لی دورِ آسماں سے سحر
سینۂ بحر پر یہ رنگِ خرام — ہند میں ہے سحر تو مصر میں شام
حیدرآباد میں مکان ہے مرا — اور پشاور میں ہمزباں ہے مرا
اپنے اپنے مکاں میں بیٹھ کے ہم — روز کرتے ہیں گفتگو باہم
بحر میں جو گہر فروزاں تھے — دور گہرائیوں میں پنہاں تھے
مہوشوں کے گلے کے ہار ہیں — قبضۂ تیغِ آبدار میں ہیں
قعرِ دریا سے اِن کو لے آیا — یہ ہے انسانِ خاک سرمایہ
دفن تھا خاک میں جو گنج گراں — کر دیا اُس کو آدمی نے عیاں
قوتیں جو ملک نہیں رکھتے — مہر و ماہ و فلک نہیں رکھتے
دیو میں ہیں نہ شیرِ غرّاں میں — جمع ہیں آب و خاکِ انساں میں
قدسیوں کو بھی جن کا علم نہیں — جن سے ناآشنا ہیں عرشِ مکیں

راز وہ کھل چکے ہیں سرتاسر
اس نحیف الوجود انساں پر

موت کا راز ہے وہ راز کہ ہم — جس سے رکے گئے ہیں نامحرم
مل گئے خاک میں جہاں کے جہاں — مٹ گئے کیسے نازنینِ انساں
بادشاہوں کی سلطنت نہ رہی — کج کلاہوں کی تمکنت نہ رہی

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو کی دوکان ہندوستان میں مشہور ہے

مصر و بابل کی داستاں بھی نہیں　　ہیکلِ روم کا نشاں بھی نہیں

زار و جسم سو رہے ہیں زیرِ زمیں　　گم ہیں ہندوستاں کے تخت نشیں

دلبرانِ سحر جمال بھی خاک　　عاشقانِ شکستہ حال بھی خاک

ہو گئے علم اس مقام پہ ختم　　روزِ روشن ہو جیسے شام پہ ختم

ہو گیا دور دل سے صبر و قرار　　عقل کرتی ہے عجز کا اقرار

پردہ اس راز سے ہٹا ہی نہیں
اس مرض کی کوئی دوا ہی نہیں

اصغر حسین خاں نظیر

شہید جستجو

مجھے عیش سے ہے نفرت کہ حریفِ ارتقا ہے
مجھے رنج میں ہے راحت کہ یہی رہِ بقا ہے
نہ شغف ہے معصیت سے نہ غرورِ اتقا ہے

نہ حریصِ زندگی ہوں، نہ حریفِ زندگی ہوں
ہے مجھے یقینِ کامل کہ ردیفِ زندگی ہوں

نہ چمن سے واسطہ ہے نہ اسیرِ رنگ و بو ہوں
نہ میں بندۂ غرض ہوں نہ غلامِ آرزو ہوں
ہے مجھے تلاش اپنی میں شہیدِ جستجو ہوں

مری کاوشوں کی غایت نہ زمین ہے نہ زر ہے
مری زندگی کا مقصد تو کہیں بلند تر ہے

امین حزیں

رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع اگر بیس ۲۰ تاریخ تک نہ دی جائیگی تو رسالہ مفت روانہ نہیں کیا جائیگا۔ منیجر

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کا عطر مقبول عام ہو گیا ہے

اہلِ دہلی اور اہلِ لکھنؤ

یہ کلیہ ہے کہ ہر شے کا ایک مرکز ہوا کرتا ہے۔ اسی کلیے کی بنا پر پہلے اہلِ دہلی نے "اردو کے ہم اہلِ زبان ہیں" دعویٰ کیا۔ لیکن اس دعوی کی ذرا صراحت ضرور ہے مثلاً وہ کیا زمانہ تھا؟ وہ کون لوگ تھے؟ اور اسباب کیا تھے؟

تذکرہ آبِ حیات میں آزاد نے مضمون، یکرنگ وغیرہ کو جو ولی اورنگ آبادی کا ہمعصر بنا کر دورِ اول میں جگہ دی ہے یہ حضرات صاحبِ دیوان نہ تھے اور اگر بعض تھے بھی تو ولی کے متبع تھے۔ کیونکہ شاہ حاتم اور مصحفی کے اقوال سے ثابت ہوگیا ہے کہ جب تک ولی کا دیوان دکن سے دہلی نہ پہنچا تھا، دہلی کی شاعری دوہوں اور کبت کے میدانوں میں گشت کر رہی تھی۔ اس کے بعد فارسی وضع سے غزل اور ردیف دار غزلوں سے دیوان مرتب ہونے لگے۔

چونکہ ولی اورنگ آبادی کے دہلوی ہمعصر شعرا کے لئے وہ ایک ابتدائی زمانہ تھا، خود نو سکھ تھے اس لئے یہ دعویٰ نہیں کیا گیا۔ دہلی میں شعرائے دورِ دوم یعنی شاہ حاتم اور خاں آرزو کے شاگردوں کا جب زمانہ آیا تو یہ حضرات اب پختہ کاری اور ہندوستان کے پایۂ تخت کی خودداری کی ترنگ میں اردو کے اہلِ زبان ہونے کا دعویٰ کرنے لگے۔ ان مدعیوں کے صفِ اول میں میر تقی میر اور ان کے ہمعصر سمجھے گئے۔ چنانچہ میر جب لکھنؤ پہنچے ہیں تو اہلِ لکھنؤ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں ؎

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو　　ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب　　رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اسکو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا　　ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

حالانکہ میر خود اکبر آباد کے تھے مگر دہلوی بن گئے تھے۔ اور مصحفی کہ یہ بھی امروہہ کے تھے مگر دہلوی بن کر کہتے ہیں ؎

دہلی کہیں ہیں جس کو زمانے میں مصحفی　　میں رہنے والا ہوں اسی اجڑے دیار کا

میں لکھنؤ میں زمزمہ سنجانِ دہر کو　　برسوں دکھا چکا ہوں تماشائے شاعری

غرض ولی مع اپنے دیوان کے سنہ ۳ جلوس محمد شاہی میں دہلی میں پہنچے ہیں اس وقت ۱۱۳۳ھ تھا۔ اور میر جب لکھنؤ پہنچے ہیں اس وقت ۱۱۹۷ھ تھا۔ گویا (۶۴) برس میں دکن کا صرف ایک استاد ولی میسر ہونے کے بعد اہلِ دہلی اردو کے اہلِ زبان بن گئے۔
اور میر لکھنؤ پہنچے (۱۱۹۷ھ) کے بعد سے ناسخ وغیرہ کے عروج یعنی ۱۲۴۲ھ تک (۴۵) سال کی مدت نظر آتی ہے کہ لکھنوی

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر منگانا چاہیے

حضرات اردو کے اہلِ زبان بن گئے[1]، کیونکہ بقول آبِ حیات، لکھنؤ میں اہلِ زبان ہونے کی ناسخ آتش ضمیر خلیق نے بنیاد ڈالی اور انیس وزیر صبا، رند، سرور نے خاتمہ کر دیا۔

گزشتہ حصۂ مضمون سے ہم واقف ہو جانے کے بعد اسی حیثیت سے حیدرآباد کو دیکھیں تو بعض چیزیں ایسی نظر آتی ہیں جس سے استعجاب و تحیّر کی کوئی حد نہیں رہتی، مثلاً ولی اورنگ آبادی سے موجودہ زمانے تک یہاں ایک قرن بھی ایسا نہیں گزرا جس میں شعرائے حیدرآباد نے خاموشی سے بسر کی ہو۔ کیوں کہ ہر عہد میں یہاں شعرا کا بڑا گروہ موجود نظر آتا ہے۔ گزشتہ دو سو برس میں خصوصاً چار دور ایک دوسرے سے ملے ہوئے ایسے گزرے ہیں کہ ان زمانوں میں اگر شعرا کی تعداد دریافت کرنا چاہو تو مشکل ہے۔

پہلا دور:۔ ولی۔ سراج۔ داؤد۔ شفیق۔ جرأت وغیرہ اور ان کے کئی صاحب دیوان معاصر اور ان کے بکثرت شاگرد اورنگ آباد و حیدرآباد میں موجود ہیں۔

دوسرا دور:۔ راجہ چندو لال شاداں (وزیر اعظم حضرت آصف جاہ ثالث) کا زمانہ ہے کہ دورا ول کے بعض اساتذہ بھی زندہ ہیں اور ان اساتذہ کے بیسیوں تلامذہ جمع ہیں جیسے شاہ حفیظ۔ خانِ تمنا۔ خواجہ ہمت۔ شاہ تجلی وغیرہ۔ اسی عہد میں دہلی کا مشہور شاعر شاہ نصیر حیدرآباد میں ہے اور شاہ حفیظ حیدرآبادی سے معرکے رہتے ہیں[2]۔

تیسرا دور:۔ حضرت پیر شمس الدین فیض رحمہ کا زمانہ ہے گو آپ شاہ حفیظ و شاہ نصیر کے معرکوں میں شریک تھے مگر حیدر فرزند شاہ حفیظ کے معاصر سمجھے گئے۔ حضرت فیض رہ کے شاگردوں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ تھی۔ اور اسی عہد میں شرر اور شوق شاگردانِ خانِ تمنا بھی استادانہ مراتب رکھتے تھے۔

چوتھا دور:۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ داغ و امیر حیدرآباد آچکے ہیں اور یہ حضرات جب حیدرآباد آئے ہیں اس وقت حضرت فیض احمد کے اکثر ارشد تلامذہ بقیدِ حیات ہیں اس کے بعد داغ وغیرہ کے بھی سیکڑوں حیدرآبادی شاگرد ہو گئے۔

افسوس ہے کہ بعض نگاہوں میں اب بھی حیدرآباد اردو کا اہلِ زبان نہیں ہے۔ !!!

یہ جو کچھ لکھا گیا صرف تمہید تھی اور اس مضمون سے میرا اصلی مقصد۔ مولوی خواجہ محمد عبد الرؤف صاحب عشرت لکھنوی کے اس مضمون پر نظر ڈالنا ہے جو "شوخیِ گفتار" کی سرخی سے (رسالہ "صلائے عام" (دہلی) جلد ۱۳ نمبر ۱۱ بابتہ نومبر ۱۹۲۶ء میں) شایع ہوا ہے اور یہ تمہید اصل مضمون سے بہت کچھ تعلق رکھتی ہے۔

بالفرض ہم یہ ماننے کے لئے تیار ہیں کہ عشرت صاحب کو اردو کے ساتھ ہمدردی کا خیال ہے۔ مگر یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ عشرت صاحب جو راستہ چل رہے ہیں، وہ اصولاً ترقیٔ اردو کی راہ ہے۔ کیونکہ مضمون "شوخیِ گفتار" سے بعض سطحی اختلافات علیحدہ کر دینے کے بعد

[1] میر، سودا، انشا، جرأت، اور مصحفی ان تمام اساتذہ میں سب کے آخر ۱۲۴۰ھ میں مصحفی کا انتقال واقع ہوا۔ اور بقول خود ناسخ (از آبِ حیات) غرض سید انشا اور مصحفی کے معرکے بھی ہو چکے۔ جرأت اور ظہور اللہ خاں نوا کے ہنگامے بھی طے ہو گئے جب زمانہ سارے ورق الٹ چکا اور میدان صاف ہو گیا تو میں نے غزل پڑھنی شروع کی۔ [2] انشاء اللہ تعالیٰ پھر کبھی شاہ حفیظ اور شاہ نصیر کا ہمطرح کلام مع مکمل موازنہ پیش کیا جائے گا۔ (عالی رفاعی)

مشکی زردہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگایئے

بھی یہ چیزیں قابل غور ہیں :۔

صفحہ ۳۶ " میں نے سنا ہے کہ والی حیدر آباد کو بھی کچھ ایسا دھوکا دیا گیا ہے کہ حیدر آباد "
" کی زبان کے محاورے دہلی و لکھنؤ کی تقلید میں نہ ہوں بلکہ حیدر آباد کے "
" لحاظ سے ہوں "

اسی مضمون میں صفحہ ۳۴ پر عثمانیہ یونیورسٹی کی بنیاد کو آپ ترقی اردو کے اسباب میں شمار کرتے ہیں اور پھر محاورے مرتب کرنے کے بارے میں دہلی و لکھنؤ کی پابندی چاہتے ہیں۔ دیکھئے !! پہلے تو آپ نے اردو کی صحیح بہی خواہی کے اصول پر چلنے کی کوشش کی تھی اس کے بعد دہلی و لکھنؤ کے افتخاری پہلو کو نہ چھوڑنے کے خیال میں حقیقی اصول ترقی اردو سے ہٹ کر بعض شہروں کی تخصیص پر اتر آئے۔ ہاں اگر آپ کا یہ خیال ہو کہ جب تک کوئی مرکز قرار نہ دیا جائے اس وقت تک حقیقی ترقی نہ ممکن ہے اس لئے کہ تمام ہندوستان میں علیحدہ علیحدہ اصطلاحات و محاورات مرتب ہونے لگیں گے۔ گو ایک حد تک یہ ٹھیک ہے مگر پہلے یہ غور لازم ہے کہ دہلی یا لکھنؤ مرکز قرار پانے کے اسباب کیا تھے ؟ اس کے جواب میں ضرور کہنا پڑیگا۔ بقول صاحب آب حیات :۔

" لکھنؤ کو دیکھ سمجھ لو کہ دلپسند ایجادوں اور رنگین باتوں کا ایجاد کسی شہر کے اینٹ "
" پتھر کی تاثیر نہیں ہے۔ ہاں شائستہ اور رنگین مزاج لوگ جہاں جمع ہوں گے "
" اور دلپذیر باتوں کے سامان موجود ہوں گے وہیں سے وہ پھول کھلنے لگیں گے "

صاحب آب حیات کی اس تحریر کو خود آپ اپنے الفاظ میں یوں ادا کرتے ہیں :۔

صفحہ ۳۷ " لکھنؤ نے جو مستند ہونے کی برکت حاصل کی اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ وہاں کے "
" لوگوں نے زبردستی یا دہلی والوں کی مخالفت کرکے زبان چھین لی، بلکہ دہلی جن لوگوں "
" سے مراد تھی ان کو اپنے یہاں جمع کیا۔ ان کی عزت کی ان کے مرتبے بڑھائے "
" ان کے ناز اٹھائے اور وہ سب معہ اہل و عیال لکھنؤ چلے آئے۔ دہلی خالی ہوگئی "
" اس وقت لکھنؤ نے اپنی سیوا کا میوا کھایا۔ "

اگر واقعی آپ کے مستند اہل زبان ہونے کے یہی وجوہات ہیں تو افسوس ہے کہ آپ نے حیدر آباد کو بھی اسی نظر سے نہیں دیکھا کہ حیدر آباد کے فرمانرواؤں اور رؤسا نے بھی اردو کے حقیقی سرپرست بننے میں کیا کیا دلچسپیاں لی ہیں۔

اگر خود داری کے پردے آنکھوں پر سے ہٹا دیئے جائیں تو حیدر آباد آج نہیں بلکہ برسوں سے مجمع علماء و ادبا نظر آئیگا اور یہ حیدر آباد ہی کا ظرف ہے کہ باوجود اتنے کملائے عصر کو اپنے خوان کرم پر جمع کر لینے کے بھی فخر و مباہات کے نعروں کو اپنی زبان پر جانے دینا تنگ ظرفی اور تنگ چشمی سمجھتا رہا۔

۱۔ کیا آپ یہ غلط ثابت کر دیں گے کہ دہلی اور لکھنؤ کے فرمانرواؤں نے اپنے استادوں کی جو حوصلہ افزائی کی تھی فرخندہ بنیاد حیدر آباد

کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کی ایک شاخ چاندنی چوک دہلی میں ہے

کے فرمانرواؤں نے اُس سے بڑھ چڑھ کر اپنے اساتذہ کی زیادہ قدر و منزلت کی (دہلی کو تو چھوڑ ہی دیجیے کیونکہ اُردو کے عروج کے ساتھ ساتھ سلطنت کا نزول ہو رہا تھا۔ بحث تو صرف لکھنو کے فیاض اور حاتم ثانی آصف الدولہ سے ہے) لکھنو میں آصف الدولہ کے استاد میر سوز کو تین سو روپیہ ماہانہ مقرر تھے۔ اور حیدرآباد میں داغ یہیں سے فصیح الملک ہوئے اور ماہانہ دو ہزار روپیہ پاتے تھے اور جلیل یہیں سے جلیل القدر اور فصاحت جنگ ہوئے اور پانسو روپیہ ماہانہ سے ایک ہزار روپیہ ماہانہ ترقی ہوئی۔

۲۔ لکھنو سے سودا کو پانچ سو روپیہ اور میر کو دو سو روپے ماہانہ مقرر تھے (کہا جاتا ہے) یہاں حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی کے متعلق جو شعبۂ تالیف و ترجمہ ہے اور دارالترجمہ سے موسوم ہے اس میں تقریباً پندرہ اراکین ہیں اور ہر رکن کی ماہوار پانچ پانچ سو روپیہ ہے اور ناظم دارالترجمہ کو ایکہزار روپے ماہوار ملتی ہے۔ کیا میر۔ سودا۔ سوز ان اراکین سے بھی کم رتبہ تھے یا اسی قدردانی کے مستحق تھے کہ جس قسم کی قدردانی ان کے ساتھ کی گئی؟

۳۔ کیا آصف الدولہ کے زمانہ میں وہاں ایک جامعۂ ملیہ (عثمانیہ یونیورسٹی) کا قیام تھا جو پانچ کروڑ کے صرفہ سے قایم کیا گیا تھا جامعہ عثمانیہ کے پروفیسروں کو یہاں چھ چھ سو روپیہ ماہوار مقرر ہے (یہاں اردو کی تعلیم لازمی ہے)

۴۔ کیا آصف الدولہ کے زمانہ میں ممالک محروسہ کے ناظم تعلیمات کو تقریباً دو ہزار روپیہ ماہوار مقرر تھی؟ جو آج یہاں ہے۔

۵۔ کیا آصف الدولہ کے زمانہ میں وہاں شاہی اور امدادی مدارس کی تعداد چار ہزار تھی! جو آج یہاں ہے۔

۶۔ کیا آصف الدولہ کے زمانہ میں وہاں مدارس میں اردو زبان کی تعلیم لازمی قرار دی گئی تھی؟ جو آج یہاں ہے۔

۷۔ کیا آصف الدولہ کے زمانہ میں ملکی دفاتر کی زبان اُردو قرار دی گئی تھی؟ جیسی کہ آج یہاں ہے۔

۸۔ کیا آصف الدولہ کے زمانہ میں ملکی تعلیم پر لاکھوں روپیہ خرچ کرنے کے بعد بھی بعض طلبہ کو امریکہ اور یورپ سے تعلیم حاصل کرنے سالانہ ساٹھ ستر ہزار روپیہ خرچ کئے جاتے تھے؟ جیسا کہ آج یہاں ہے۔

صفحہ ۲۳ پر درج ہے "زبان کے بارے میں دہلی کی اولیت ہمیشہ قایم رہے گی۔ لکھنو نقش ثانی" "ہے اب خدا کوئی آصف الدولہ جیسا فیاض حاتم ثانی پھر پیدا کرے تو وہ" "نقش ثالث بھی بنا سکتا ہے"

ہم اس بحث کو سردست نہیں چھیڑنا چاہتے کہ اولیت دہلی[1] کو ہے یا دکن کو۔ کیونکہ اس کے لئے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہوگی اور یہاں صرف آصف الدولہ کی علمی سرپرستیوں اور ادبائے عصر کی حوصلہ افزائیوں سے بحث تھی جس کا تذکرہ ابھی گزر چکا ہے۔

اب حیدرآباد کی حوصلہ افزائیوں اور قدردانیوں کے بعض مناظر دیکھئے

[1] اگر آپ اس بارے میں تحقیق کے جویاہیں تو میرا مضمون "تحقیق اردو" رسالہ تحفہ جلد ۲ نمبر ۲ و ۳ بابتہ صفر و ربیع الاول شریف ۱۳۴۴ھ میں شایع ہوا ہے بلاحظہ فرمایئے (عالی ہاشمی)

عطر حنا جیسا اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو سے ملیگا دوسری جگہ نہیں مل سکتا

۱۔ مولوی غلام امام شہید[1] لکھنوی شاگرد قتیل و مصحفی کو سرکار آصفیہ سے چار سو تیس روپیہ ماہوار بلا شرط حاضری یعنی دربار داری مقرر تھی:

۲۔ میر احمد علی خاں شہید شاگرد شاہ نصیر کو (بعہد ولی عہد) آصف جاہ رابع کے اتالیقوں میں مامور فرمایا گیا تھا، اور آصف جاہ رابع نے اپنے عہد حکومت میں انہیں امیر الشعرا خطاب سرفراز فرمایا

۳۔ ذوالفقار علی خاں صفا شاگرد دبیر۔ چندولال شاداں کے یہاں سے پانچسو روپیہ ماہانہ مقرر تھے۔

۴۔ رضا طلب خاں فدائی دہلوی کو آصف جاہ اول کے زمانہ میں قلعداری و فوجداری قلعہ رائچور سرفراز فرمائی گئی تھی۔

۵۔ مرزا علی لطف (صاحب تذکرہ گلشن ہند) آصف جاہ ثانی کے زمانہ میں چار سو روپیہ ماہانہ سے سرفراز تھے۔

۶۔ مرزا قمر الدین منت شاگرد میر شمس الدین فقیر آصف جاہ ثانی نے ایک وقت دس ہزار روپیہ انعام اور دو سو روپیہ ماہوار سے سرفراز فرمایا تھا۔

۷۔ راجہ مدن سنگھ موزوں آصف جاہ اول اور ناصر جنگ شہید کے زمانوں میں دو ہزاری منصبداروں میں شریک اور خطاب راجہ سے ممتاز تھے۔

۸۔ مرزا علی رضا مرہون دہلوی شاگرد میر ممنون دہلوی چندولال شاداں کے یہاں سے سو روپے ماہوار مقرر تھی۔

۹۔ حافظ تاج الدین مشتاق (بعض تذکروں میں انہیں شاگرد ناسخ لکھا ہے) چندولال شاداں کے یہاں سے پانچ سو روپے ماہانہ مقرر تھے۔

۱۰۔ شاہ نصیر دہلوی شاگرد میر محمدی مائل انہیں بھی چندولال شاداں ماہانہ سات سو پچاس روپیہ دیا کرتے تھے۔

۱۱۔ محمد عیسیٰ خاں آفاق دہلوی
۱۲۔ محمد موسیٰ خاں شہرت دہلوی
} شاگردان قائم چاندپوری، ان ہر دو بھائیوں کو شمس الامرا امیر کبیر کے یہاں سے دو دو سو روپیہ ماہانہ مقرر تھے۔

۱۳۔ شاہ حفیظ حیدرآبادی کو چندولال شاداں نے سلطنت کی طرف سے ملک الشعرا کا خطاب اور ایک ہزار روپیہ ماہوار مقرر کردی تھی۔

۱۴۔ آصف جاہ سادس نے اپنے استاد فصیح الملک کو ایک وقت اسی ہزار روپیہ مرحمت فرمایا تھا۔

اب ناظرین غور کریں اردو کی حقیقی سرپرستی اور اساتذہ کی حوصلہ افزائی دہلی اور لکھنؤ میں کی گئی یا حیدرآباد میں۔
الحمدللہ کہ حیدرآباد اپنے ہمچشموں میں ہمیشہ ممتاز رہا۔ اور آج کل ہندوستان کے گوشہ گوشہ کے مدارس۔ انجمنیں۔ کانفرنس وغیرہ اسی دولت ابد مدت سے وظائف، چندے۔ ماہواریں حاصل کرکے اپنی اپنی حیات قایم رکھ کر علمی و ادبی دلچسپیوں میں مصروف ہیں۔
اور اگر آپ کو یہ خیال ہو کہ حیدرآباد اردو زبان میں جو ترقی کر رہا ہے وہ آج سے سمجھی جانا چاہیئے۔ اور لکھنؤ کی ترقی اس سے بیشتر کی ہے، تو اس کا جواب حیدرآباد کی قدردانیوں کے ضمن میں گذر چکا ہے تاہم مزید جواب اور سن لیجیے۔

---

[1] بعض انہیں ناسخ کا شاگرد بھی کہتے ہیں (عالی رفاعی)

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگائیے

(تذکرہ آب حیات پہلے دور کی تمہید) اس دور میں ولی تو مجلس کی شمع ہیں اور اہل مجلس ولی اور دکن کے شریف

"دلچسپ فصیح زبان میں۔ جو کچھ دیکھتے ہیں اُسی روشنی سے دیکھتے ہیں۔ اُن کی"

"زبان ایک ہی سمجھنا چاہیئے"

اب آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ اُس زمانے میں بھی دکن اور دہلی کی زبان ایک ہی سمجھی گئی ہے جس زمانے میں لکھنو کا اِس عالم میں وجود بھی نہ تھا۔ خداوند کریم آباد رکھے اس سلطنت کو کہ منصب۔ جاگیر۔ معاش۔ ماہوار کی وجہ ایک بڑی جماعت تلاشِ روزگار سے مستغنی ہے[۵] صاحب تذکرہ آب حیات نے اس بارے میں بھی لکھ دیا ہے:۔

"دہلی برباد لکھنو ویران۔ دونو کے سندی اشخاص کچھ پیوند زمین ہو گئے"

"کچھ در بدر خاک بسر، اب جیسے اور شہر ویسے ہی لکھنو جیسے چھاؤنیوں کے"

"بازار ویسے ہی دہلی بلکہ اُس سے بھی بدتر"

رنگین مزاجی اور شگفتہ دلی۔ بیفکری کے کرشمے ہیں جو طبیعت خود بخود جدت پسند اور باریک بیں ہوجاتی ہے اور بیفکری بقائے سرپرست کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ مدت ہوئی کہ سلطنت اور ریاست کے ہمراہ، بیفکری رنگین مزاجی شگفتہ دلی۔ دہلی اور لکھنو سے ہمیشہ کیلئے رخصت ہوگئیں اور جو جو خصوصیتیں کسی زمانہ میں حیدرآباد دہلی اور لکھنو کو متفقہ طور پر کم و بیش حاصل تھیں آج اُن تمام خوش نصیبوں کا مالک بذاتِ واحد صرف حیدرآباد ہی ہے اور خصوصاً اردو کے لئے معمورۂ ادب ہے اور شاعری اہلِ حیدرآباد کا عام مشغلہ ہے۔

جدید اصطلاحات و محاورات مرتب کرنیکا حق صرف دہلی و لکھنو پر منحصر نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ اردو کے لئے کوئی اور مرکز قرار پانا کچھ نوبت نہیں ہے۔ جو عقائدِ اسلام کے موافق ابھی اور کا نبی ہونا ناممکن ہے۔

آج ہم مصلح اردو ہیں! اور ہمیں اردو میں ہر قسم کے اصطلاحات و محاورات مرتب کرنے۔ تذکیر و تانیث اور رسم الخط کے اصطلاحات مقرر کرنے اور ہر قسم کی تراش خراش کرنیکا بخوبی حق حاصل ہے۔ اور دہلی و لکھنو کے جدید اصطلاحات و محاورات، جن میں پنجابیت اور پوربی پن بڑھ رہا ہے نہ ہم اُنہیں مستند سمجھتے ہیں اور نہ اس کے پابند ہوسکتے ہیں۔

ہم جو مدعیِ زبان اردو ہیں تو اس بارے میں دہلی سے زیادہ لکھنو کو خلش ہے اس لئے کہ لکھنو کے مقابل دہلی کو اسی قسم کی ایک شکست ہوچکی ہے۔ مگر لکھنو کو یہ نیا سابقہ ہے اور سابقہ بھی دلخراش !!!

مجھے اصل مضمون سے زیادہ اس رائے پر حیرت ہوتی ہے جو خان بہادر میر ناصر علی خانصاحب ایڈیٹر صلائے عام (دہلی) کی طرف سے ختم مضمون پر شائع ہوئی ہے۔

"جناب عشرت صاحب نے یہ مضمون بڑے کام کا لکھا، کوئی کچھ کہے جلے"

"اردو کی ٹکسال دہلی اور لکھنو ہی ہے اور رہے گی۔ اس کے سوا جو اس"

---

[۵] اب اہل دہلی اور اہل لکھنو تلاش معاش میں سرگرم رہیں یا زبان اور شاعری میں جدتیں یا رنگینیاں دکھلائیں؟ (علی رفاعی)

اصغر علی محمد علی کا ہر عطر نہایت مشہور ہے

زبان کا دعویٰ کرے ٹکسال باہر سمجھیے "

مجھے حیرت اسی وجہ سے ہے کہ خان بہادر سے ایسی امید نہ تھی جو ایک لایعقلانہ خود داری کی تائید کر جائیں گے، کیونکہ خان بہادر کو میں دور موجودہ اُن دہلوی اساتذہ میں سمجھتا ہوں اور اُن ہستیوں میں شمار کرتا ہوں کہ زمانہ پھر پچاس برس پیچھے ہٹ جائے تو ایسے لوگ نظر آئیں۔
ہاں شاید یہ وجہ ہو کہ عشرت صاحب نے دہلی اور لکھنؤ کی متفقہ عظمت برقرار رکھنے کیلئے خان بہادر کو بھی اپنا ہم نوا بنانا چاہا ہے۔ چنانچہ صفحہ ۳۶ پر خان بہادر کو یوں متوجہ کرتے ہیں:۔

" کیونکہ آپ ہم ایک ہی کے کشتی کے سوار ہیں، یہ ڈوبی تو ہم سب ڈوبیں گے "

اگر اہلِ دہلی و لکھنؤ ہماری زبان کو ٹکسال باہر سمجھتے ہیں تو اہلِ حیدرآباد کی نظروں میں بھی دہلی اور لکھنؤ کے جدید اصطلاحات و محاورات ادیان منسوخہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔

رسالہ " صلائے عام " (دہلی) جلد × نمبر × بابتہ اگست ۱۹۲۶ء صفحہ ۷ پر خان بہادر کی طرف سے اسی قبیل کی ایک اور تحریر شایع ہوئی ہے:۔

" یہاں ایک بات اور عرض کرنے کے قابل ہے کہ اردو کے لئے دو ہی مقام "
" معتبر سمجھنے چاہئیں۔ دہلی اور لکھنؤ۔ ان دو شہروں کے سوا جو اردو کا دعویٰ "
" کر رہے ہیں انہیں کچھ نہیں کہنا چاہیئے، زبان کی توسیع کے لئے جس قدر "
" جہاں کے رہنے والے کوشش کریں چشم ما روشن دل ما شاد۔ لیکن جب ادائے "
" بیان میں گفتگو ہو تو غیروں سے بحث مناسب نہیں، مقصود یہ ہے کہ زبان "
" کا جس قدر بھلا ہو اچھا ہے، حضرت موجد کا شعر ہے ؎ "

" چاند پر خاک نہ ڈالے سے پڑیگی موجد "
" ہم کو شاعر نہ کہے کوئی تو کیا ہوتا ہے "

آپ کے خیال میں جب ہماری اردو زبان غیر معتبر ہے تو ہمارا توسیع زبان میں کوشش کرنا آپ کے چشم روشن اور آپ کا دل شاد کہاں ہوا۔ بلکہ اثر برعکس ہوگا۔ کیونکہ ہم غیر ہیں اور اصلاح اردو تو صرف اہلِ دہلی اور اہلِ لکھنؤ کا حصہ ہے[۱] اور آخر کا یہ فقرہ کہ " مقصود یہ ہے کہ زبان کا جس قدر بھلا ہو اچھا ہے " پھر کیا معنی؟
بہر حال ایسی باتیں سوائے اس کے کہ اشتعال انگیز ثابت ہوں اور کیا تصوّر کی جاسکتی ہیں۔ مختصر یہ کہ اس مضمون کو میں اپنی ایک نظم پر ختم کرتا ہوں۔

---

[۱] یہاں اہلِ دہلی اور اہلِ لکھنؤ سے وہ کوتہ نظر اور تنگ چشم اصحاب مراد ہیں جو محض حد درجہ بے جا خود دارانہ طور پر حیدرآباد سے چشمکیں کیا کرتے ہیں، دگرنہ دہلی اور لکھنؤ کے وہ اصحاب جنہیں حقیقت مد نظر رہتی ہے اور جو انصاف کو ہات سے جانے نہیں دیتے وہ مقر ہیں کہ بیشک حیدرآباد مجمع علماء و ادبا ہے اور حیدرآباد کے ثقات کی اردو زبان بہت صاف و شستہ ہے، لیکن یہ کلیہ بھی ذہن نشیں رہنا چاہیئے کہ ثقات ہی کی زبان مستند ہوا کرتی ہے اور عام زبان کہیں کی بھی مستند نہیں۔ (عالی رفاعی)

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگانا چاہیئے

اُردو ہماری ہے

قیامِ جامع عثمانیہ حجت ہماری ہے ۔۔۔ کہ اُردو کی بھی سلطانِ دکن کو تاجداری ہے
نگاہِ لطف نے شاہِ دکن کے یہ شرف بخشا ۔۔۔ کہ ہر تقریر اور تحریر میں اُردو ہی ساری ہے
سند ہم اصطلاحوں میں نہ لیں گے اہلِ دہلی کی ۔۔۔ خود اپنی بذلہ سنجی کی مہیا ہم کو یاری ہے
دلائل لکھنؤ کے کیوں نہ ہوں تقویمِ پارینہ ۔۔۔ کہ جب فکرِ رسا اپنی رہم میں سازگاری ہے
دُرِ شہوار سو ایک ایک لفظ اچھا نکالے گی ۔۔۔ ہماری طبع گوہر بار میں جب آبداری ہے
سند ہر لفظ اپنا مستند ہیں بندشیں اپنی ۔۔۔ جو ہم ناسخ زباں کے ہیں تو جدت اختیاری ہے
اگر پابند ہم خذ ما صفا دع ما کدر کے ہیں ۔۔۔ تو پھر اصلاح میں اردو کی ہم کو کامگاری ہے
کبھی ہنستی تھی دہلی لکھنؤ پر۔ کیا ہوا آخر! ۔۔۔ جو ہنسنے ہم پر کوئی مفت اُسکی دلفگاری ہے
زبانِ حیدرآبادِ دکن آزاد ہونے سے ۔۔۔ کسی کو بے قراری ہے کسیکو اشکباری ہے !
دکن کے بعد دہلی اور پھر تھا لکھنؤ مصلح؛ ۔۔۔ دکن پھر "مصلحِ اُردو" ہے یہ بھی فضل باری ہے

ہمارے سامنے عالیؔ کسے دعویٰ ہے اُردو کا
ہمیں اہلِ زبانِ اردو کے ہیں "اُردو ہماری ہے"

عالیؔ رفاعی

چھپ گیا ۔۔۔ چندروار ڈ اُردو شارٹ ہینڈ ۔۔۔ چھپ گیا

ایک ماہر زود نویس کی قابلِ قدر رائے

مکرمی شیخ صاحب۔ اسلام علیکم ورحمتہ اللہ برکاتہ۔ چندروارڈ اُردو شارٹ ہینڈ کی کتاب میں نے بہ نظرِ تعمق پڑھی۔ واقعی کتاب سلیس اور مختصر سے مختصر لفظوں میں لکھی گئی ہے معمولی محنت اور تھوڑے وقت میں مبتدی ایک ماہر زود نویس بن سکتا ہے واقعی اس کتاب کی مدت سے ضرورت تھی والسلام - دستخط غلام حسن شارٹ ہینڈ رائٹر دفتر ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر جھنگ

ملنے کا پتہ الٰہ بخش رحیم بخش بکسیلر گجرات

خیمے - دریاں - یا چرمی سامان درکار ہے یا پہلے ان کی فہرست منگا کر دیکھنا مطلوب ہے تو آج ہی

محمد حسین اینڈ کو ٹنٹ مرچنٹ فتحگڑھ

کو لکھیئے، بڑے بڑے رؤسا اور والئی ریاست ان ہی کے یہاں سے مال منگاتے ہیں - ان کے یہاں مال عمدہ اور ارزاں ملتا ہے پتہ صاف لکھیئے

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگانا چاہیئے

میر قافلہ کی صدا

راہ تیری پُر خطر،
آہ تیری بے اثر
یاس کا دل میں گزر
خوف سے لرزاں نظر،
ہار نہ ہمّت مگر
تیز چل اے ہمسفر آتی ہے منزل ابھی

جادۂ منزل نیا
ناقۂ محمل نیا
منظر ساحل نیا
اور تو غافل نیا
عزم نیا، دل نیا
تیز چل اے ہم سفر آتی ہے منزل ابھی

کیوں ہے گرفتارِ غم،
دیکھ یہ نقش قدم
پڑتے ہیں جو دم بدم
دشت میں مل کر بہم
راہ بتاتے ہیں ہم
تیز چل اے ہم سفر آتی ہے منزل ابھی

مڑ کے مری جانب دیکھ
حد بیاباں نہ دیکھ
سوئے گریباں نہ دیکھ
خارِ مغیلاں نہ دیکھ
ہو کے ہراساں نہ دیکھ
تیز چل اے ہمسفر آتی ہے منزل ابھی

آہ شرر بار کر،
چشم کو بیدار کر
گریۂ خونبار کر
خار کو گلنار کر
دشت کو گلزار کر
تیز چل اے ہم سفر آتی ہے منزل ابھی

واقفِ اسرار ہوں
طالبِ آزار ہوں
تیرا نگہدار ہوں
مونس و دلدار ہوں
میں ترا غمخوار ہوں
تیز چل اے ہمسفر آتی ہے منزل ابھی

محمود اسرائیلی۔

کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو کی شہرت عطر حنا سے ہوئی

غزلیات

اکبر حیدری

امید کے خلاف کوئی مہرباں ہے آج ۔۔۔ مخصوص بیکسی مری آخر کہاں ہے آج
دنیا مری تھی جن میں محبت سے پیشتر ۔۔۔ کیا یہ وہی زمیں وہی آسماں ہے آج
وہ دل کہ جس کو سمجھے تھے اک بوند خون کی ۔۔۔ برہم کنِ سکونِ غمِ دوجہاں ہے آج
اللہ صبر دے کہ مرا ضبطِ مستقل ۔۔۔ منت کشِ نوازشِ آہ و فغاں ہے آج
شاید ہے کوئی تازہ مصیبت نصیب میں ۔۔۔ کیا بات ہے کہ کوئی بہت مہرباں ہے آج
کیوں سرنگوں نہو مری معصوم آرزو ۔۔۔ بیتابیوں کے ہاتھ میں دل کی عناں ہے آج

شاید صنم کدے سے نکالے گئے ہیں آپ
اکبر خدا کا نام جو وردِ زباں ہے آج

دل (شاہجہاں پوری)

اپنی ہستی بھی اک فسانہ ہے ۔۔۔ قفسِ تنگ آشیانہ ہے
فتنہ پرور پھر اک نگاہ ادہر ۔۔۔ دل اسی تیر کا نشانہ ہے
حسن کا ناز اہلِ دل کا نیاز ۔۔۔ یہ فسانہ عجب فسانہ ہے
چشم جاناں ترے اشارہ پر ۔۔۔ منحصر گردشِ زمانہ ہے
آج تک وہ نظر نہیں آئے ۔۔۔ دوستی اُن سے غائبانہ ہے
سرگزشتِ فراق کیا کہیے ۔۔۔ دل کی ہر آہ اک فسانہ ہے
یوں مٹا مینگے داغ ناکامی ۔۔۔ سر ہے اور اُنکا آستانہ ہے
نیند اُچٹ جائے جسکے سننے سے ۔۔۔ وہ فسانہ مرا فسانہ ہے
دل سے کہتی ہے سائل کی کہ ۔۔۔ بس یہیں تک ترا فسانہ ہے

خود بخود جھک رہی ہے اپنی جبیں
کس کا اے دل یہ آستانہ ہے

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو سے عطر منگائیے

رزمی بھوپالی

نظر کو دور میں لا، ساغرِ شراب بنا — مے شباب سے دنیا کو پھر خراب بنا
نگاہ نے جسے چمکا دیا وہ دل میں رہا — جو داغ دل میں ابھرا وہ آفتاب بنا
نگاہِ بیخودیِ شوق دیکھ ہی لیگی، — ہزار ہوش کے پردوں کو تو نقاب بنا
فروغِ حسن کی نیرنگیاں معاذ اللہ، — کہیں شراب بنا اور کہیں شباب بنا
رہینِ عشرتِ مے کیوں ہو بزمِ ہستی میں — لہو کو جوش دے، دل کو خمِ شراب بنا
اِس انفعال نے بدلی ہیں صورتیں کیا کیا — کبھی گناہ بنا اور کبھی ثواب بنا

ہزار عشق و محبت کی بستیاں اُجڑیں
کہیں جب ایک یہ رزمی دل خراب بنا

کوثر

یہ مانا تم کو دنیا والے حسن کا آقا کہتے ہیں؛ — کچھ اُن کی خبر بھی ہے تم کو جو غم میں گھلتے رہتے ہیں
یہ آگ جو دل میں سلگتی ہے اس آگ کا نام محبت ہے — سینے میں جو ہے اک شعلہ سا اس شعلے کو دل کہتے ہیں
کیا اس سے بڑی بھی اے واعظ کوئی اور قیامت ہوتی ہے — جب آ کے چلے جاتے ہیں وہ ہم اسکو قیامت کہتے ہیں
جو آنکھیں تمہارے جلووں کی تصویر اتارا کرتی تھیں — تم دیکھو تو اُن آنکھوں سے اب خون کے دریا بہتے ہیں

شعروں سے ہمارے بھی کیا کیا ہنگامے ہوتے ہیں برپا
نوحی نہیں ہم لیکن کوثر طوفاں اُٹھاتے رہتے ہیں

کیفؔ مراد آبادی

کیا اثر اے بیخودی دیدِ جاناں کر دیا — ہستیٔ پرجوش کو اک جسمِ بیجاں کر دیا
اب کہاں ظرفِ دلِ مجبور میں وہ حوصلہ — کیا کیا تو نے کہ زلفوں کو پریشاں کر دیا
میرے نالوں کی معاذ اللہ یہ برہم زنی — گلشنِ ہستی کو ہمرنگِ بیاباں کر دیا
قطرۂ بے کیف تھا مصروفِ ذوقِ بیخودی — حسن کی رنگینیوں نے اس کو انساں کر دیا
تیری محفل کی یہ شورش اُف نگاہِ فتنہ گر — جذبۂ مجبور کو شعلہ بداماں کر دیا

اُس کے ہر انداز کے قربان ہو جاؤں نہ میں کیفؔ
مجھ سے کافر کو بھی لذت کیشِ ایماں کر دیا

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ملتا ہے

ہادی مچھلی شہری

جب نہ چھوٹا قید کی تعزیر سے — سر کو ٹکرا یا کیا زنجیر سے
کام ہی کوئی نہیں بنتا، مرا — لاگ ہے تقدیر کو تدبیر سے
ایک زخم دل میں آئی لذتیں — ایک دنیا بس گئی اک تیر سے
اب ہے پائے شوق اور افتادگی — چل گئی تدبیر کی تقدیر سے
آسماں دیکھے زرا اپنی طرف — سابقہ ہے نالۂ شبگیر سے
شاد کام اور وہ بھی میری زندگی — بدگماں ہو جاؤں گا تقدیر سے
اسکے آگے وہ سکوت بے محل — کم نہ تھی حالت مری تصویر سے
چارہ ساز و مجکو صحت ہو محال — کیوں اُلجھتے ہو بُری تقدیر سے
ختم بھی ہو قصۂ رنج و الم — جان بھی نکلے کسی تدبیر سے

درد دل بھی مجکو ہادی کم نہ تھا
کیوں اُلجھتا کاتب تقدیر سے

یوسف گجراتی

زرا وہ حسن کو اپنے چھپاکے دیکھہ تو لیں — وہ پہلے حشر سے محشر اُٹھاکے دیکھہ تو لیں
کرینگے عکس کو جوہر عطا تکلم کے — مگر وہ آئینہ رُخ کو بناکے دیکھہ تو لیں،
سنبھل ہی جائیں گے اے ہوش حضرت موسیٰ — زرا وہ حسن کی تاثیر آکے دیکھہ تو لیں

کہاں کلیم کہاں طور اور کہاں یوسف،
وہ برق سوز نگاہیں اُٹھاکے دیکھہ تو لیں

شانِ حُسن

یک نظر کردی و شد ہر زخم جنت در کنار — یک ادائے ناز، شرح صد معمائے بہار
یک سخن گفتی و دنیا در عدم شد بیقرار — یک تبسم کردی و شورِ جہاں شد آشکار
یک اشارت کردی و صد داستاں آمد پدید

ناز مہر رودولوی

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو کی دوکان مقبول ہند ہے

آسمانی سوار

(فسانہ)

۱۸۶۱ء کے موسم خزاں میں ایک روشن سہ پہر کے وقت ایک سوار گھنے جنگل میں پڑا ہے، یہ مقام سڑک کے ایک کنارے پر ہے جو مغربی ورجینیا کو جاتی ہے۔ سوار پیٹ کے بل لیٹا ہوا ہے۔ جوتے کی نوک زمین پر ٹکی ہے۔ سر بائیں بازو پر رکھا ہوا ہے۔ پھیلا ہوا داہنا ہاتھ بندوق کی گرفت سے خالی نہیں صرف اعضا کی باقاعدہ طبعی حالت اور پیٹی سے بندھے ہوئے کارتوس بکس کی خفیف جنبش اُس کی حیات کی تصدیق کر رہی ہے۔ وہ اپنی ڈیوٹی کے وقت سو رہا ہے اور اگر اس حالت میں دیکھ لیا جائے تو انصاف و قانون کا تقاضہ یہ ہے کہ یہی اس کی آخری نیند ہو جائے۔

درختوں کے اس دلفریب اور گنجان کنج کے سامنے حدِ نظر تک بلند پہاڑ ہے جس کی ایک وسیع و مسطح چٹان باہر کو نکلی ہوئی ہے۔ پہاڑ کے دامن میں سوار کی خوابگاہ سے دور ایک عظیم الشان عمیق جنگل واقع ہے اگر کوئی ہموار چٹان سے گرے تو جنگل کے درختوں تک پہنچنے کے لئے اس کو ایک ہزار فٹ کا فاصلہ طے کرنا پڑے گا۔ سوار جس کنج میں محوِ خواب ہے وہ اس قدر بلندی پر واقع ہے کہ اگر وہ بیدار ہوتا تو نہ صرف چٹان اس کی نظر کے سامنے ہوتی بلکہ دامنِ کوہ کے غار کی پہنائی کا بھی اندازہ کر سکتا جس کی طرف ایک نظر ہی پریشانیٔ حواس و دورانِ سر کے لئے کافی ہے۔

سوار کی آرام گاہ سے کچھ فاصلے پر اس کی فوج پڑی ہوئی ہے۔ دن بھر کی مسافت کے بعد اب دم لیا ہے، رات کے وقت کوچ کریگی اور اس مقام سے گزرتی ہوئی جہاں اس کا غافل سنتری پڑا ہوا ہے کوہستانی راستوں کو طے کر کے سوتے ہوئے دشمن پر حملہ آور ہوگی۔ بے خبری میں دفعتاً حملہ کرنے پر کامیابی منحصر ہے۔ اگر دشمن کا کوئی سپاہی کہیں چھپا ہوا ہے اور ان کی قیام گاہ اور نقل و حرکت سے آگاہ ہو جائے تو شکست ظاہر اور ہلاکت یقینی ہے۔ ورجینیا ان کی منزل مقصود ہے اور اس کی تسخیر ان کا مقصد سفر۔

محوِ خواب سنتری کارٹر ڈروز ورجینیا کا ایک نوجوان تھا۔ متمول والدین کا فرزند یگانہ۔ جس راحت و آرام اور تعلیم و تربیت سے بہرہ اندوز ہو سکتا ہے وہ سب اسکو میسر تھی۔ ایک دن صبح کو ناشتہ کی میز سے اٹھتے وقت نہایت سکون و سنجیدگی کے ساتھ باپ سے بولا "ابا! ایک یونین رجمنٹ گریفٹن میں آگئی ہے میں اس میں شامل ہونے کے لئے جاتا ہوں"

باپ نے سر اٹھایا۔ بیٹے کے چہرے پر ایک لمحہ نظر ڈالی اور کہا "جاؤ کارٹر، اور ہر حالت میں وہی کرنا جو تمہارا فرض ہو، ورجینیا جس سے تم جنگ کرنے جا رہے ہو تمہارے بغیر باقی رہ سکتا ہے۔ اگر ہم دونوں جنگ کے بعد زندہ رہے تو اس معاملہ پر گفتگو کریں گے۔ تمہاری ماں کی حالت جیسا کہ طبیب نے تم سے بیان کر چکا ہے نہایت نازک ہے۔ چند ہفتوں سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ لیکن یہ زمانہ نہایت قیمتی ہے۔ بہر حال اس وقت اسکو پریشان کرنا مناسب نہیں"

کارخانہ اصغر علی محمد علی کو قایم ہوئے ایک سو سال ہوئے

کارٹر ڈرورز نے سر تسلیم خم کیا باپ نے جس انداز سے جواب دیا وہ قلب مجروح کا پردہ پوش تھا، کارٹر اپنے گہوارہ طفلی کے خلاف داد شجاعت دینے کے لئے روانہ ہوگیا۔

احساس فرض و دلیری، وفاداری و سرفروشی کے کارناموں نے اُس کو تھوڑے ہی زمانہ میں ہم عمروں میں ممتاز اور افسروں کی نظر میں وقیع بنا دیا۔ یہی اوصاف اور سرزمین وطن کی واقفیت تھی کہ اس کو دشمن کی سرحد پر پاسبانی کی خطرناک ڈیوٹی پر مقرر کیا گیا، لیکن مسلسل راہ اور خستگی سفر، عزم و استقلال پر غالب آگئی اور نیند نے آدبایا۔

خدا جانے کس نیکی یا بدی کے فرشتے نے خواب میں آکر اس کو اس خواب مجرمانہ سے بیدار کردیا، بغیر حرکت اور بغیر آواز کے عمیق سکوت اور شام کے آخری سکون میں کسی غیبی کاتب تقدیر نے اس کے دیدہائے شعور کو مس کیا اور اس کی روح نے کانوں میں وہ پر اسرار بیدار کن الفاظ پھونک دیے جو کسی انسانی ہونٹوں سے نہیں نکلے اور کسی انسانی حافظہ کو یاد نہیں۔ اُس نے خاموشی کے ساتھ اپنے بازو سے پیشانی کو اُٹھایا اور داہنے ہاتھ سے رائفل کی گرفت کو تنگ کرکے درختوں پر نظر ڈالی۔

سب سے پہلے اس کو اس مسرت و فرحت کا احساس ہوا جو صناع عالم نے مناظر قدرت کے اندر پیدا کردی ہے، پہاڑ کے پر ہیبت پایہ پر سطح چٹان کے آخری کنارے پر افق آسمان کے مقابل ایک سوار کا شاندار بت کھڑا تھا۔ انسانی مجسمہ گھوڑے پر سپاہیانہ انداز سے بیٹھا تھا۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک یونانی دیوتا سنگ مرمر سے تراشا گیا ہے۔ سوار کا ہلکا سبز لباس اخضر فلک کے ہمرنگ تھا، اُس کا چہرہ کسی قدر بائیں جانب مڑا ہوا تھا۔ کنپٹی اور داڑھی کا ایک حصہ نظر آتا تھا۔ وہ نیچے کی عمیق و وسیع وادی کی طرف دیکھ رہا تھا، سوار کی فلک پیما بلندی اور قرب دشمن کے احتمال و خوف نے سپاہی کی نظر میں اس مجسمہ کو نہایت ہیبت ناک بنا دیا۔

ایک لمحہ کے لئے کارٹر ڈروز کو یہ معلوم ہوا کہ وہ اختتام جنگ تک سوتا رہا ہے اور یہ مجسمہ یادگار فتح کے طور پر بلندی کوہ پر نصب کیا گیا ہے لیکن یہ احساس مجسمہ کی خفیف حرکت سے فوراً باطل ہوگیا، گھوڑے نے بغیر پاؤں کو حرکت دیے اپنے جسم کو پیچھے کی طرف کھینچا۔ سوار بدستور بےحس و حرکت رہا۔

کارٹر کے حواس درست ہوگئے، خواب، خیال ہوگیا اور موقع کی اہمیت و نزاکت کو دیکھکر اُس نے رائفل کا نشانہ درست کیا۔ نال کو جھاڑیوں کے اندر سے نکال کر گھوڑا چڑھا لیا اور سوار کے سینے کو ہدف کے لئے انتخاب کرلیا۔ کیا اچھا ہوتا کہ انگلی سے ایک اشارہ بھی کردیتا، لیکن اس لمحہ میں سوار نے سر کو جنبش دی اور پوشیدہ دشمن سپاہی کی طرف دیکھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی نگاہیں سپاہی کے چہرے آنکھوں اور دل کے اندر سرایت کر رہی ہیں۔

کیا جنگ میں دشمن کو ہلاک کرنا اس قدر خوفناک ہے۔ خصوصاً ایسے دشمن کو جس نے دفعتاً اس راز کو معلوم کرلیا ہے جو ہماری اور ہماری فوج کی حفاظت کا ضامن ہے۔ ایسے دشمن کو جو اپنے علم و آگاہی کے سبب سے اپنی کثیر التعداد فوج سے زیادہ خطرناک ہے! کارٹر پر موت کی سی زردی چھا گئی۔ غصہ سے عضو عضو کانپنے لگا۔ چکر آنے لگے اور سوار کا مجسمہ ایسا نظر آنے لگا گویا ایک تصویر ہے جو آتش آسمان کے

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر بکفایت ملتا ہے

اندر چکر لگا رہی ہے، ہات کی گرفت رائفل پر سے سست ہوگئی اور سر آہستہ آہستہ جھک کر زمین پر پڑی ہوئی پتیوں پر جا لگا، شجاع، جوان اور جری سپاہی کو جوش جذبات سے مغلوب ہو کر غش آرہا ہے۔

یہ حالت دیر تک نہ رہی دوسرے ہی لمحہ میں اُس کا سر زمین سے اٹھا۔ ہاتھ رائفل پر اپنی اپنی جگہ پہنچ گئے، اُنگلی نے گھوڑے کو تلاش کر لیا دماغ، دل، نظر درست ہوگئی، ہوش و خرد ٹھکانے آگئے، غنیم کے سوار کو گرفتار کر لینا نا ممکن تھا۔ اور ہوشیار کر دینا اپنی ہلاکت کا موجب سپاہی کا فرض ظاہر تھا۔ جھاڑی کے اندر ہی سے سوار کو ہدف بندوق بنا دینا چاہیئے۔ بغیر اطلاع کئے بغیر ایک لمحہ تیاری مرگ کے۔ بغیر ایک وقفہ دعائے آخری کے اس کو اس خطرناک مخبری و راز جوئی کی سزا دینی چاہیئے، لیکن نہیں ایک ذرا سی امید باقی ہے۔ ممکن ہے اس نے کچھ نہ دیکھا ہو۔ ممکن ہے وہ محض مناظر قدرت سے لطف اندوز ہونے کے لئے آیا ہو، اگر موقع دیا جائے تو وہ اُلٹے پاؤں واپس چلا جائے گا اور یقیناً اُس کے انداز مراجعت سے ظاہر ہو جائیگا کہ اُس کا مقصد کیا تھا۔ اب کارٹر نے پھر مجسمہ سوار و اسپ پر نظر جائی اور رائفل گھوڑے کو نشانہ بنانے کے لئے تانکا۔ یکایک اُس کے دماغ میں وہ الفاظ گونجنے لگے جو اُس کے باپ نے رخصت کے وقت کہے تھے کہ "ہر حالت میں وہی کرنا جو تمہارا فرض ہو" اِن الفاظ نے ایک سکون پیدا کر دیا۔ دانت عزم و استقلال کے ساتھ بند ہوگئے۔ اعضا ایک محو خواب بچہ کی طرح ساکن ہوگئے، نبض اصلی رفتار پر آگئی، سانس کی آمد و رفت میں باقاعدگی پیدا ہوگئی، فرض شناسی نے فتح پائی، روح نے جسم سے کہا "ٹھہر اور خاموش ہو" اور اُس نے فیر کر دیا۔

کارٹر کی فوج کا ایک افسر جو محض تفریح کی غرض سے یا معلومات حاصل کرنے کے لئے کیمپ سے نکلکر مصروف سیر و گردش تھا اُس پہاڑ کے قریب پہنچا اور اُس لمحہ میں جب کارٹر نے فیر کیا افسر کی نظر اُٹھی اور ایک حیرت ناک منظر نظر آیا۔ ایک شخص گھوڑے پر سوار فضائے آسمانی سے گذرتا ہوا وادی کی طرف جا رہا ہے۔ سوار سپاہیانہ وقار کے ساتھ گھوڑے کی پشت پر جما بیٹھا ہے۔ لگام کو پوری قوت سے پکڑے ہوئے ہے کہ گھوڑا اس ہبوط میں غیر ضروری عجلت سے کام نہ لے، برہنہ سر پر لمبے بال ہوا میں اُڑ رہے ہیں۔ داہنا ہاتھ گھوڑے کی اُٹھی ہوئی ایال کے بادل میں پوشیدہ ہے۔ گھوڑے کا جسم ایسا ہموار ہے کہ گویا ہر قدم زمین پر پڑ رہا ہے۔

اس آسمانی سوار کے نظارہ سے افسر پر اس درجہ حیرت و ہیبت طاری ہوئی کہ ٹانگوں میں لرزش پیدا ہوگئی اور گر پڑا۔ تقریباً اسی لمحہ میں وادی کے درختوں میں ایک آواز پیدا ہوئی اور پھر سکوت چھا گیا۔ افسر لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا اور اس نظارہ پر خواب کا گمان کرتا ہوا کیمپ کی طرف روانہ ہوگیا۔ اور اس خیال سے کہ ایک ناقابل یقین واقعہ کو بیان کرنا اقرار جہالت کا مترادف ہے خاموش رہا اور کسی سے کچھ نہ کہا۔

کارٹر ڈروز نے فیر کرنے کے بعد رائفل کو پھر بھر لیا اور پاسبانی شروع کر دی مشکل سے دس منٹ گزرے ہونگے کہ اس کی فوج کا ایک سارجنٹ آہستہ آہستہ ہاتوں اور گھٹنوں کے بل سرکتا ہوا اسکے قریب پہنچا، کارٹر نے اُس کی طرف مطلق اعتنا نہ کی لیعد بدستور بےحس و حرکت لیٹا رہا۔

جب عطر منگاؤ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے

"کیا تم نے فیر کیا تھا؟" سارجنٹ نے آہستہ سے سوال کیا۔

"ہاں"

"کس پر؟"

"ایک گھوڑے پر۔ وہ سامنے کی چٹان پر کھڑا تھا۔ دیکھو اب نظر نہیں آتا۔ نیچے غار میں گر پڑا"، کارٹر کا چہرہ سفید تھا۔ لیکن اس نے اپنے تلاطم جذبات کو چھپائے رکھا۔ جواب دیکر منہ پھیر لیا اور خاموش ہو گیا۔ سارجنٹ کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ایک لمحہ کے سکوت کے بعد بولا "ڈرو ذرا ادھر دیکھو۔ چھپانے کی ضرورت نہیں۔ میں حکم دیتا ہوں کہ رپورٹ دو کیا گھوڑے پر کوئی شخص سوار تھا"؟

"ہاں"

"کون"؟

"میرا باپ"

سارجنٹ اچھل پڑا اور بے اختیار اُس کے منہ سے نکلا "اللہ اللہ!" اور یہ کہکر خاموشی کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

حامد حسن قادری بچھرایونی

(ترجمہ)

دنیائے صحافت میں انقلاب عظیم
روزنامہ الکلام بنگلور کا پہلا نمبر
یکم جنوری ۱۹۲۷ء کو نہایت شاندار پیمانہ پر ملک کے سحر طراز ادیبوں کی زیر ادارت
پچیس ہزار کی تعداد میں شایع ہوگا
سیاست حاضرہ پر بہترین مضامین، رنگین پُر از معلومات تبصرے دلچسپ اور دلکش نظمیں تفریح طبع کیلئے حیرت انگیز فسانے ملکی و غیر ملکی براہ راست حاصل کی ہوئی خبریں
درج اخبار ہوا کریں گی۔
یقیناً یہ اخبار سارے دکن میں اپنی طرز کا واحد اور پہلا اخبار ہوگا
اپنے شہر سے پچیس علم دوست اور لائق احباب کے پتے روانہ کرنیوالوں کو ایک دلچسپ ناول مفت دیجائیگی۔
مشتہرین
کو دکن میں اپنی تجارت کو فروغ دینے کیلئے یہ زرین موقع ہے
جلد از جلد پہلے نمبر میں اپنے اشتہاروں کیلئے جگہیں مخصوص کرالیں۔
نرخنامہ اشتہارات اور نمونۂ اخبار آج ہی
مفت طلب کیجیے
بپتہ مینیجر اخبار الکلام بنگلور

اعتراف خطا

نومبر کے رسالہ نگار میں بسلسلۂ استفسارات لفظ حوت کو غلطی سے مونث

استفسارات

ظاہر کیا گیا ہے یہ سہو تھا لیکن اسکو مذکر ماننے کے بعد بھی اصل بحث اپنی جگہ باقی رہتی ہے۔

(ایڈیٹر)

قرآن اور اس کا غلط جغرافیہ

(بہ جواب استفسار مسٹر جے مارٹن مندرجہ نگار ماہ دسمبر ۱۹۲۶ء)

(نگار) آپ نے سب سے پہلی غلطی تو عنوان قائم کرنے میں کی ہے، کیونکہ آپ کے اعتراضات کا تعلق زیادہ تر جیالوجی (طبقات الارض) سے ہے نہ کہ جغرافیہ سے اور دوسری غلطی یہ کی ہے کہ قرآن کے بتائے ہوئے "غلط جغرافیہ" میں آپنے احادیث کو بھی شامل کر لیا ہے۔ جو بالکل اصول بحث کے خلاف ہے پھر آپنے یہ ظلم اور کیا ہے کہ نہ احادیث کی اصل عبارت درج کی اور نہ قرآن مجید کی۔ لیکن چونکہ قرآن کی آیات کے ذکر میں آپ نے سورہ کا حوالہ دیدیا ہے اس لئے انھیں تو میں نے ڈھونڈھ نکالا، لیکن احادیث کے متعلق چونکہ اس قدر تحریر کی بھی زحمت گوارا نہیں فرمائی کہ کہاں اور کس کتاب میں آپنے دیکھا ہے اس لئے میں نے خود اُس خدمت کو انجام دینا مناسب نہیں سمجھا، جو آپ کو کرنی چاہیئے تھی۔ اس لئے جواب میں صرف کلام مجید کی اُن آیات سے بحث کروں گا۔ جن کے مطالب پر آپ کو "غلط جغرافیہ" کا شبہ ہوا ہے اور احادیث سے اس وقت کوئی گفتگو نہ کرونگا جب تک آپ ان کا پورا حوالہ نہ دیں اور اصل عبارت نہ نقل کریں۔

(۱) آپ کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ کلام مجید (سورۂ طلاق) میں لکھا ہے کہ خدا نے سات آسمان پیدا کئے اور اتنی ہی زمینیں۔ اسی کے ساتھ آپنے ایک حدیث کا بھی حوالہ دیا ہے جس میں طبقات زمین کے باشندوں، کرۂ ارض کا ایک فرشتہ کے کندھے پر قایم ہونا اور اسی طرح کی اور چند بے سر و پا باتوں کا ذکر کیا ہے۔ میں اس حدیث یا کسی اور عالم کے قول سے اس جگہ کوئی گفتگو نہ کروں گا، کیونکہ اول تو آپ نے نہ اصل عبارت نقل کی ہے اور نہ یہ تحریر فرمایا ہے کہ یہ حدیث آپ نے کہاں دیکھی اور دوسری یہ کہ اس قسم کی حدیثیں اکثر نامعتبر و موضوع ہیں اور درایتاً پایۂ تحقیق سے گری ہوئی ہیں، لیکن سورہ طلاق کی اُس آیت کا مفہوم ضرور آپ کو بتاؤں گا جس میں سات آسمان اور سات زمینوں کے پیدا کرنیکا حال درج ہے۔

(کلام مجید کی آیت یہ ہے)

اللہ الذی خلق سبع سموات ومن الارض مثلھن یتنزل الامر بینھن لتعلموا ان اللہ علی کل شئ قدیر وان اللہ قد احاط بکل شئ علماہ۔ (سورۂ طلاق۔ آیت ۱۲)	اللہ وہ ہے جس نے پیدا کئے سات آسمان اور زمینیں بھی اتنی ہی اللہ کا حکم ان میں نازل ہوتا رہتا ہے تاکہ تم جان سکو کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور یہ کہ اللہ کا علم ہر چیز کو محیط ہے!

اس پر اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ کلام مجید میں آسمان و زمین کی تعداد سات بتائی گئی ہے حالانکہ آسمان کا کوئی وجود فی الخارج نہیں ہے

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو کا عطر بہت مشہور ہو گیا ہے

زمین صرف ایک ہے اور اگر سات زمینوں سے اس کے طبقے مراد ہوں تو بھی یہ کہنا صحیح نہیں کیونکہ اُس کے طبقات خدا جانے کتنے ہیں۔

کلام مجید میں آسمان یا سمآء وسموٰت کا ذکر بہت جگہ آیا ہے اور ان پر غور کیا جائے تو آسانی سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ قرآن میں جو مفہوم آسمان کا بتایا گیا ہے وہ کسی طرح موجودہ نظریہ کے منافی نہیں ہے۔

عربی زبان میں لفظ سمآء آسمان کے لئے کوئی اصطلاحی لفظ نہیں ہے بلکہ ہر اُس منظر کے لئے استعمال ہوتا ہے جو بلند نظر آئے۔ چنانچہ غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کلام مجید میں کہیں لفظ سمآء بول کر صرف بادل مراد لئے گئے ہیں جیسے او کصیب من السمآء یا انزل من السمآء ماءً ہیں اور کہیں صرف فضائے بسیط مقصود ہے جیسے " ثم استوی الی السمآء وہی دخان " ہیں۔

اس لئے یہ بحث طلب امر رہجاتا ہے کہ اگر سمآء یا سماوات سے مراد صرف فضاء بلند ہے تو سورہ طلاق میں سبع سموٰات کا کیا مطلب ہو سکتا ہے

عربی زبان میں الفاظ سبع (سات) سبعین (ستر) اور سبع مأتہ (سات سو) جس طرح محدود عدد کے اظہار کے لئے آتے ہیں اسی طرح بعض جگہ اُن سے صرف اظہار کثرت مراد ہوتا ہے، یعنی سات، ستر وغیرہ بول کے صرف کثرت کا ظاہر کرنا ہوتا ہے۔ سورہ برات میں ارشاد ہوتا ہے ان تستغفر لہم سبعین مرۃ فلن یغفر اللہ لہم (اگر تم اِن کے لئے ستر مرتبہ مغفرت طلب کروگے تو خدا انہیں معاف نہ کریگا) ظاہر ہے کہ یہاں ستر سے مراد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ تم کتنی ہی مرتبہ طلب مغفرت کرو لیکن اللہ معاف نہ کریگا، کیونکہ اگر عدد معین مراد ہوگا تو یہ معنی ہونگے کہ اگر ستر مرتبہ کے بعد اکترویں مرتبہ مغفرت طلب کی گئی تو اللہ معاف کر دیگا، جو بالکل لغو و مہمل بات ہے۔

الغرض اول تو سورہ طلاق کی اس آیت میں سبع کے معنی سات کے نہیں ہیں بلکہ محض کثرت کے اظہار کے لئے آیا ہے اور اس بناء پر یہ معنی ہوں گے کہ ہم نے بہت سے آسمان بنائے اور بہت زمینیں پیدا کیں، اس لئے اب تحقیق طلب صرف سموٰات اور ارض کا مفہوم رہجاتا ہے سو اس کے متعلق جس وقت کلام مجید کی آیات پر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح سمآء بادل اور بلندی کے معنی میں استعمال ہوا ہے اسی طرح مدار کے معنی میں بھی آیا ہے (مدار سے مراد وہ خط ہے جس پر ایک سیارہ گردش کرتا ہے۔ اور جسے انگریزی میں Orbit کہتے ہیں) چنانچہ ایک جگہ نہایت صاف صاف بجائے سموٰات کے لفظ طرائق (راستے) استعمال کیا گیا ہے، ملاحظہ ہو سورہ مومنون آیت ۱۷ (ولقد خلقنا فوقکم سبع طرائق) یعنی بنائے ہم نے تمہارے اوپر فضا میں بہت سے راستے یا مدار جن پر سیارے گردش کرتے ہیں۔ تفسیر بیضاوی میں بھی لفظ سمآء کے تحقیق اس طرح کی گئی ہے:۔

" والمراد بالسمآء ہذہ الاجرام العلویۃ او جہات العلو" یعنی سمآء سے مراد اجرام علوی (کواکب وسیار) ہیں یا بلند اطراف"

سورہ الذاریات میں ارشاد ہوتا ہے " والسمآء ذات الحبک " حبک جمع ہے حبیکہ کی اور حبیکہ کہتے ہیں راستہ کو، اس لئے یہاں سمآء سے مراد ہوئی وہ فضا جس میں سیاروں کے راستے یا مدار واقع ہوئے ہیں۔

اب رہ گیا یہ امر کہ اگر سورہ طلاق کی اس آیت میں سموٰات سے سیاروں کے مدار مراد ہیں تو اس کا کیا مطلب ہوگا کہ زمینیں بھی اتنی ہی پیدا کی گئیں، سو امام راغب نے اس کا بہترین فیصلہ کیا ہے کہ " ہر سمآء ایک فلک ہے اپنے تحت کے لحاظ سے اور زمین ہے اپنے فوق کے لحاظ سے " یعنی ہر سیارہ جس طرح نیچے واقع ہونیوالے سیارہ کے لحاظ سے فلک کا حکم رکھتا ہے اسی طرح وہ اپنے سے

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو سے ہر قسم کا عطر ملتا ہے

بلند واقع ہونے والے سیارہ کے لحاظ سے زمین کا حکم رکھتا ہے اور اس لئے خدا کا یہ ارشاد کہ جتنے ہم نے افلاک بنائے اتنی ہی زمینیں پیدا کیں بالکل حقیقت کے موافق ہے۔

اگر سبع کے معنی یہاں سات کے لئے جائیں تو بھی نادرست نہیں کیونکہ سبع سیارہ کا علم اس وقت بھی لوگوں کو تھا اور اس لحاظ سے سورہ طلاق کی یہ آیت گویا اس وقت کے دریافت شدہ نظام شمسی سے بحث کرتی ہے۔

(۲) آپ کا دوسرا اعتراض سورہ نحل کی کسی آیت پر ہے جس کو آپ نے نقل تو نہیں کیا لیکن اس کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ "خدا نے زمین پر پہاڑ بنائے تاکہ وہ جنبش میں نہ آئے" تلاش سے صرف ایک آیت سورہ نحل میں ایسی ملی ہے جہاں پہاڑوں کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ یہ ہے:۔

والقیٰ فی الارض رواسی ان تمید بکم

آپ نے اس کا ترجمہ و مفہوم خدا معلوم کس انگریزی مترجم و مفسر کی کتاب سے اخذ کیا ہے، اگر آپ اس کے حقیقی مطلب کو سمجھ لیتے تو بجائے کسی شبہ کے آپ کو قرآن کے کلام الٰہی ہونیکا یقین ہو جاتا کیونکہ یہ آیت زمین اور پہاڑ کی نسبت وہی معلومات پیش کرتی ہے جو علمائے طبقات الارض نے دریافت کی ہے۔

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ خدا نے زمین میں پہاڑ پیدا کر دیے تاکہ وہ جنبش میں نہ آئے اس حال میں کہ تم اس پر آباد ہو۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ زمین پہلے بالکل اہتزاز و اضطراب کی حالت میں تھی اور اس قابل نہ تھی کہ انسان اسپر آباد ہو سکتا، لیکن جب رفتہ رفتہ اس میں انجمادی کیفیت پیدا ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اس کی جھریاں منجمد ہو کر پہاڑ بن گئیں تو وہ انسانی آبادی کے قابل بن سکی اور پھر اس کی کیفیت اہتزاز جاتی رہی

القیٰ فی الارض رواسی سے مقصود صرف یہی ظاہر کرنا ہے کہ زمین کی مضطرب حالت کو دور کیا گیا، یہاں تک کہ اس میں پہاڑ پیدا ہو گئے۔

اور ان تمید بکم سے مراد یہ ہے کہ زمین انسانی آبادی کے قابل بن گئی۔

(۳) آپ کے تیسرے اعتراض میں غالباً سورہ حجر[لہ] کی حسب ذیل آیات کی طرف اشارہ ہے۔

"ولقد جعلنا فی السماء بروجا و زینّٰہا للناظرین

وحفظنٰہا من کل شیطان رجیم۔ الا من

استرق السمع فاتبعہ شہاب مبین"

آپ نے ان آیات کے سمجھنے میں بھی غلطی کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ کے مبعوث ہونے سے قبل عرب میں کاہنوں کی بڑی کثرت تھی جو طرح طرح کی پیشین گوئیاں کرکے لوگوں کو ڈراتے رہتے تھے۔ وہ مدعی تھے کہ ان کے موکل یا جن آسمان کی باتیں سن سن کر انھیں بتاتے ہیں اور سیاروں کی حرکت اور بروج کے مطالعہ سے سعد و نحس ساعتوں کا علم انھیں ہوتا ہے۔

ان آیات میں بروج سے وہی ہیئت کے برج مراد ہیں (نہ کہ نشانیاں جیسا کہ آپنے سمجھا ہے) اور اسی زبان و اصطلاح میں ان کاہنوں کا

لہ جے مارتین صاحب نے اس سورہ کا نام انگریزی میں "Haam" لکھا ہے حالانکہ فی الاصل یہ لفظ حجر ہے اور اسے "Hijr" لکھنا چاہیئے تھا۔ یہ ہے ہمارے معترض کی قابلیت کا عالم (ایڈیٹر)

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو سے ہر قسم کا عطر منگانا چاہیئے

حال بیان کیا گیا ہے جو اس وقت مستعمل تھی۔ شیطان رجیم سے کاہن مراد ہیں یا وہ موکل جن کو وہ اپنا تابع بتاتے تھے۔ لفظ رجیم نہایت لطیف اشارہ اُن کی جھوٹی پیشین گوئی کی طرف کرتا ہے جیسا کہ اس طرح کی لغو پیشین گوئی کو رجم للغیب بھی کہتے ہیں۔ سورہ ملک کی ایک آیت سے اور زیادہ اسکی تصدیق ہوتی ہے ملاحظہ ہو آیت ۵:۔

ولقد زینا السماء الدنیا بمصابیح وجعلنا رجوماً للشیاطین ط

اس آیت میں نمایاں طور پر کاہنوں کو شیاطین اور اُن کی پیشین گوئی کو رجم بالغیب کہا گیا ہے۔

استراق السمع سے مراد کاہنوں کی وہ بعض باتیں ہیں جو علم ہیئت کے رو سے (مثلاً کسوف و خسوف کی پیشین گوئیاں) صحیح اترتی تھیں اور شہاب مبین سے مدعا واقعی انگارہ یا ٹوٹنے والا ستارہ نہیں ہے بلکہ مجازاً بمعنی خسران و ناکامی، تباہی و بربادی استعمال کیا گیا ہے کیونکہ اُس وقت لوگوں کا یہی عقیدہ تھا کہ جب ستارے ٹوٹتے ہیں تو ضرور کوئی آفت آتی ہے۔

اب ان آیات کا مفہوم یہ ہوا کہ آسمان میں جو بروج ہیں اُن کے متعلق کاہنوں کا یہ کہنا کہ اُن پر اُنہیں اقتدار حاصل ہے بالکل غلط ہے کیونکہ خدا نے اُن کو رجم بالغیب کرنے والے اور محض ظن و گمان پر پیشین گوئیاں کرنے والے کاہنوں کی دسترس سے محفوظ رکھا ہے اور اگر کبھی کبھی کوئی پیشین گوئی اُن کی (مثلاً کسوف یا خسوف وغیرہ کے متعلق) صحیح ہو جاتی ہے تو اس پر قیاس کر کے اور باتوں پر بھروسہ نہ کرنا چاہئیے، کیونکہ وہ تو ایسی ہیں جن کو شہاب مبین نے باطل کر دیا ہے۔ شہاب مبین سے مراد یہاں اسلام و قرآن ہے نہ کہ ٹوٹنے والا ستارہ۔ چونکہ یہاں ذکر بروج وغیرہ کا تھا اس لئے اُسے شہاب مبین کہا گیا۔ جو اسلوب بیان کی پاکیزگی کی آخری حد ہے اور جس سے اُن کے اس اعتقاد کی طرف بھی لطیف اشارہ ہوتا ہے کہ ستاروں کے ٹوٹنے کو وہ بربادی کی علامت سمجھتے تھے۔

(۴) آپ کا چوتھا اعتراض یہ ہے کہ قرآن میں روزہ رکھنے کے متعلق یہ حکم ہے کہ جب سفید خط سیاہ خط سے نمودار ہو تو روزہ شروع کیا جائے اور رات تک اُس کو جاری رکھا جائے لیکن شمالی ممالک میں جہاں ہفتوں کا دن ہوتا ہے اس پر عمل ناممکن ہے اور اس لئے اسلام کی تعلیم ایسی نہیں ہے جس پر ہر ملک کا انسان عمل کر سکے۔

خیط ابیض کا خیط اسود سے نمودار ہونا، صرف طلوع صبح کے معنی رکھتا ہے اس لئے روزہ کا حکم یہ ہوا کہ طلوع صبح سے اُس کی ابتدا کرو اور شام کو ختم کر دو۔ یا با الفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ پورے دن بھر روزہ رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ شمالی ممالک میں جہاں دن بہت طویل ہوتے ہیں یقیناً اس پر عمل نہیں ہو سکتا، لیکن جہاں کلام مجید میں یہ ہدایت کی گئی ہے، وہیں اور احکام بھی قابل غور ہیں مثلاً ارشاد ہوتا ہے:۔

"کتب علیکم الصیام کما کتب علی اللذین من قبلکم لعلکم تتقون ایاما معدودات"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روزہ کی میعاد صرف محدود و متعین دنوں تک محدود ہے اور وہ مہینہ سے متجاوز نہیں ہو سکتا، پھر جن ممالک میں مہینوں آفتاب غروب نہیں ہوتا وہاں دن کا شمار طلوع و غروب کے حساب سے نہیں ہوتا اور نہ اس حساب سے مہینہ متعین کیا جاتا ہے بلکہ اسی ایک طویل دن کے ٹکڑے کر کے متعدد شب و روز متعین کئے جاتے ہیں اس لئے ایسے ممالک میں روزہ کا حکم بھی اسی تعین کے لحاظ سے ہوگا اور جس طرح تمام کاروبار میں عمل و راحت کی تفریق ہوگی اسی طرح روزہ کی بھی تعیین ہوگی۔

ہر قسم کا عطر محمد علی اصغر علی سے منگائیے۔

کلام پاک میں ایک اور آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سال وغیرہ کا حساب کرنے میں طلوع قمر کا لحاظ کیا جائے نہ کہ طلوع شمس کا، ارشاد ہوتا ہے

"ہو الذی جعل الشمس ضیاءً والقمر نوراً و قدرہ منازل لتعلموا عدد السنین والحساب"۔

اس میں قدرہ کی ضمیر قمر کی طرف راجع ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سالوں کا حساب چاند کی مقررہ منازل کے لحاظ سے کیا جائیگا۔ نہ کہ آفتاب کے طلوع و غروب سے۔ اس لئے شمالی ممالک میں جہاں دن بہت طویل ہوتا ہے اگر چاند کے منازل کے لحاظ سے حساب کیا جائیگا تو روزہ ویسا ہی آسان ہو جائیگا جیسا دوسرے ممالک میں (اگر آپ کو چاند کے ان منازل کے سمجھنے میں اشکال واقع ہو تو مجھ سے دریافت فرما سکتے ہیں)

علاوہ اس کے لایکلف اللہ نفساً الا وسعہا سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ایسے ممالک میں ایام صیام کی تعین اسی انداز سے کی جائیگی جو معتدل ممالک میں رائج ہے۔

ایک مرتبہ رسول اللہؐ سے صحابہ نے دریافت کیا کہ "اے رسول اللہؐ ایسے ملکوں میں جہاں دن ایک ماہ یا اس سے زیادہ کا ہوتا ہے، وہاں روزہ کا کیا حکم ہوگا، آپ نے فرمایا کہ "اپنے دن کے لحاظ سے اس کی تقسیم کرلینی چاہیئے"۔

کیا اب بھی جے مارٹن صاحب یہ اعتراض کرینگے کہ رسول اللہؐ اور اس زمانہ کے لوگ اس حقیقت سے ناواقف تھے، کہ شامی ممالک میں دن بہت طویل ہوتا ہے، اور کیا ان آیات کے ہوتے ہوئے بھی ان کو یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ احکام اسلام دنیا کے لئے ناقابل عمل ہیں۔

چار کتابیں

الفاروق۔ مکمل ہر دو حصہ مع نقشہ دنیائے اسلام، علامہ شبلی کی سیرت حضرت عمرؓ پر مشہور کتاب ہے عہ

ابو مسلم خراسانی جرجی زیدان مصری کے مشہور ناول کا اردو ترجمہ عہ

نقش ارژنگ جلال الدین صاحب اکبر کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ عہ

خطوط شبلی عطیہ بیگم فیضی اور زہرا بیگم فیضی کے نام قیمت عہ

مینیجر نگار بھوپال

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگایئے

کتب موصولہ

نفسیاتِ ترغیب نفسیات کا علم بہت وسیع ہے اور اس کے ماتحت متعدد مباحث زیر غور آسکتے ہیں جو مستقلاً ایک فن یا علم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے یقیناً کوئی ایک شخص اس امر کا مدعی نہیں ہو سکتا کہ اُس نے فن نفسیات پر کافی عبور حاصل کر لیا ہے۔ یا وہ اس فن کی تمام شعبوں پر ماہرانہ نظر رکھتا ہے۔ یورپ میں اس کے منشعبات پر مختلف لوگوں نے اختصاصی مہارت حاصل کرکے علیحدہ علیحدہ کتابیں لکھی ہیں اور پھر بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس وقت تک اس فن کی تحقیق و تفتیش مکمل ہو کر اس کی تمام شاخوں کا احاطہ ہو سکا ہے۔

اردو میں سب سے پہلے مولوی عبدالماجد صاحب بی۔اے دریابادی نے علم النفس کے شعبۂ جذبات و اجتماع کے متعلق اپنی گرانقدر تالیفات پیش کیں اور اسی وقت سے ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ حلقۂ مصنفین و مؤلفین میں اس نوع کے علوم کو اردو میں منتقل کرنے کا خیال پیدا ہوا۔

کتاب زیر تبصرہ بھی علم النفس ہی کی کتاب ہے جو اس کے ایک شعبہ یعنی ترغیب کی ماہیت نفسی اور اس کے مظاہر کو الگ سے بحث کرتی ہے۔ اس کتاب کا اصل ماخذ مسٹر میکفرش کی انگریزی تالیف "Psychology of Persuasion" ہے لیکن اس کے ساتھ فاضل مؤلف سید وہاج الدین احمد کنتوری پروفیسر عثمانیہ کالج اورنگ آباد دکن نے دیگر تصانیف و مقالات سے بھی استفادہ کیا ہے جس سے بقول عبدالماجد صاحب "یہ کتاب ترجمہ نہیں رہی بلکہ اچھی خاصی تالیف بن گئی ہے"

اس کتاب کے آٹھ باب ہیں جن میں ترغیب کی ماہیت نفسی اور اس کے مختلف صورتوں سے بحث کی ہے، ہم نے اس کتاب کے پانچویں چھٹے، اور ساتویں باب کو نہایت دلچسپی سے پڑھا۔ جن میں ترغیب فنون لطیفہ، ترغیب اشتہارات و اخبارات، اور ترغیب ظرافت و خوش طبعی وغیرہ سے بحث کرکے بعض مثالوں کے ذریعہ سے بہت پر لطف بنایا گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب اس سے زیادہ شگفتہ و سہل انداز میں مرتب ہو سکتی تھی، لیکن موجودہ اسلوب بیان اور طرز تحریر بھی بہت کافی دلچسپ ہے۔

یہ کتاب نہ صرف طلبہ نفسیات اور ان حضرات کے مطالعہ میں آنی چاہیئے جنھیں علمی مباحث سے لگاؤ ہے، بلکہ میرے نزدیک کاروباری لوگوں کو بھی اس سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے، کیونکہ تجارت کی کامیابی کا راز بھی ترغیب و تشویق ہی میں پنہاں ہے اور اگر ہم علمی حیثیت سے اس کا مطالعہ کریں تو عملی زندگی میں اس سے بہت زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

یہ کتاب ۱۱۲ صفحات کو محیط ہے اور دو روپیہ میں دارالمصنفین اعظم گڈھ سے مل سکتی ہے۔

خطوطِ شبلی یہ مجموعہ ہے مولانا شبلی کے صرف اُن خطوط کا جو انھوں نے بمبئی کی دو نہایت مشہور خاتونوں زہرا بیگم فیضی اور

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر ملتا ہے۔

عطیہ بیگم فیضی) کے نام لکھے تھے۔ بڑا حصہ اُن خطوط کا ہے جن میں عطیہ بیگم سے خطاب کیا گیا ہے اور غالباً یہی حصّہ زیادہ پُر لطف ہے کیونکہ مولانا کو عطیہ کے ساتھ بہت لطف تھا، اور اسی لئے اُن میں کہیں کہیں نہ صرف شاعرانہ بلکہ والہانہ کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔ ایک شخص جب خط لکھتا ہے تو یہ خیال اُس کے سامنے نہیں ہوتا کہ کبھی یہ شائع بھی ہوں گے اس لئے اس میں وہ بہت سی ایسی باتیں لکھ جاتا ہے جن سے اس کی زندگی اور اُس کے جذبات پر نہایت صحیح روشنی پڑتی ہے اور یقیناً اس مجموعہ میں بعض خطوط مولانا شبلی کے بھی ایسے ہیں جن سے اُن کے ذوقِ رنگین کا پورا پتہ چلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس حال میں لکھے گئے ہیں کہ مولٰنا شبلی اس واقعہ سے خالی الذہن تھے کہ کبھی یہ شایع بھی ہوں گے۔

مولوی محمدؐ امین صاحب زبیری اور سید محمد یوسف صاحب قیصر کا ملک کو ممنون ہونا چاہئیے کہ انھوں نے ان خطوط کو یکجا کر کے شایع کر دیا۔ اس مجموعہ لطیف کی قیمت ایک روپیہ ہے اور دفتر نگار سے مل سکتا ہے۔

یادِ ایّام مولوی عبد الحئیؒ مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء کی مشہور تصنیف ہے جو اس سے قبل تعلیمی کانفرنس علی گڑھ کی طرف سے بھی شایع ہو چکی ہے۔ اب اس کو شبلی بک ڈپو لکھنؤ سے دوبارہ شائع کیا ہے اور قابلِ قدر اضافہ یہ کیا ہے کہ مولانا مرحوم کے حالاتِ زندگی بھی اُن کے صاحبزادہ مولوی سید عبد العلی ندوی سے مرتب کرا کے شامل کر دیئے ہیں۔

گجرات کی اسلامی تاریخ اور وہاں کے علماء و مشائخ کے حالات میں اس سے بہتر کوئی تصنیف اس سے قبل شایع نہیں ہوئی، مولٰنا عبد الحی مرحوم کی عکسی تصویر بھی اس میں لگا دی گئی ہے قیمت ۱۲؎ مقرر ہے جو ۲۰۰ صفحات کی ضخامت کو دیکھتے ہوئے یقیناً زاید ہے۔

اصلاحِ سخن جناب شوق سندیلوی نے اپنی چند غزلیں ملک کے بعض مشہور اساتذۂ سخن کے پاس اصلاح کی غرض سے بھیجی تھیں اور اب ان سب اصلاحوں کو یکجا کر کے اصلاحِ سخن کے نام سے شائع کیا ہے۔ خیال اچھوتا تھا، لیکن بہتر ہوتا اگر شوق صاحب ہر استاد کو اس امر کی بھی اطلاع دیدیتے کہ وہ اسی غزل کو دیگر حضرات کے پاس بھی بھیج رہے ہیں اور بعد کو وہ یہ تمام اصلاحیں یکجا شائع کریں گے تاکہ لوگ زیادہ محنت و کاوش سے کام لیکر اصلاح دیتے۔

اس مجموعہ میں بعض اساتذہ کے خطوط بھی ہیں اور ان میں سے چند یقیناً ایسے ہیں جنھیں کبھی نہ شایع کرنا چاہئیے تھا۔ مجھے شوق صاحب کی یہ ادا پسند نہیں آئی۔

کتاب یقیناً بہت دلچسپ ہے اور ایک ہی وقت میں ایک ہی شعر کے متعلق مختلف اساتذہ کی مختلف رائیں معلوم کر کے بہت لطف آتا ہے کتابت طباعت کا نہایت دلکش اہتمام کیا گیا ہے اور غالباً ۲ دو روپیہ میں جناب شوق سندیلوی محلہ متھوانہ سندیلہ سے مل سکتی ہے۔

احمد خان وغیرہ آقا کرمانی بی۔ اے نے جو مدرسۂ عالیہ حیدرآباد میں فارسی کے مدرس ہیں، فارسی زبان میں ایک افسانہ اس نام کا شایع کیا ہے، میں قصص و حکایات کی کتابیں بہت کم پڑھتا ہوں اور اس کو بھی بالاستیعاب پڑھنے کا ارادہ نہ تھا، لیکن جب ریویو کی غرض سے میں نے اس کے ابتدائی چند صفحات دیکھے تو میں مجبور ہو گیا کہ اس کو ایک ہی نشست میں ختم کر دوں۔

اس رومان کا پلاٹ اس قدر دلچسپ اور بعض مفید مباحث پر اس درجہ لطیف انداز سے بحث کی گئی ہے کہ فاضل مصنف کے زورِ قلم کی

کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کا تار کا پتہ "خا" ہے

داد دینی ہی پڑتی ہے۔
زبان کے لحاظ سے کچھ کہنا بیکار ہے کیونکہ مصنف ایرانی ہیں اور اچھا ذوق انشا رکھتے ہیں، وہ لوگ جو جدید فارسی کے محاورات والفاظ سیکھنا چاہتے ہیں اُن کے لئے اس کا مطالعہ بہت مفید ثابت ہوگا، اور جو حضرات صرف پلاٹ کی خوبی اور افسانہ کی ندرت کو دیکھنا چاہتے ہیں اُن کے لئے اس میں بہت کچھ سامان دلچسپی موجود ہے، کم از کم مجھے تو اس کا پلاٹ اس قدر اچھا معلوم ہوا ہے کہ اگر میں کسی فلم بنانیوالی کمپنی کا مالک ہوتا تو یقیناً اس افسانہ کو صور متحرکہ میں منتقل کر دیتا۔
اس کتاب کی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ہے اور مصنف کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

البیت المعمور فی عمارت القبور — مولوی سید علی نقی (صدر الافاضل) نے مسئلہ قباب و قبور اور مآثر و مقابر کے متعلق اس رسالہ میں قرآن و حدیث سے استدلال کر کے ثابت کیا ہے کہ نجدیوں کا موجودہ طرز عمل بالکل ناجائز ہے اس میں شک نہیں کہ مولوی صاحب موصوف نے نہایت خوبی کے ساتھ منقولات سے اپنے مدعا کو ثابت کیا ہے، لیکن یہ رسالہ زیادہ مکمل ہو جاتا اگر معقولات کے نقطۂ نظر سے بھی بحث کی جاتی، کیونکہ میرے نزدیک بقائے آثار (جس میں قباب و قبور یقیناً شامل ہیں) تمدنی اور سیاسی حیثیت سے بھی نہایت ضروری ہے اور نجدیوں کا ہدم مآثر و قباب ایسا لغو و لایعنی فعل ہے جس کو کوئی مہذب انسان کبھی روا نہیں رکھ سکتا
یہ رسالہ نور المطابع وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ سے مل سکتا ہے

آئینِ اردو — یہ اردو قواعد کی کتاب ہے جس میں ہجا اور صرف و نحو سے نہایت بسیط گفتگو کی گئی ہے۔ میری رائے میں اس سے قبل کوئی کتاب اردو قواعد پر ایسی مبسوط و جامع نہیں لکھی گئی، وہ حضرات جو اردو زبان کا قواعد کی رو سے مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، اُن کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔
ملک کو جناب فرجاد کوٹانوی کا ممنون ہونا چاہیے کہ انہوں نے ایک مفید کتاب کا اضافہ اردو زبان میں کیا ضخامت ۳۴۶ صفحات، طباعت وغیرہ بہت صاف قیمت عہ ملنے کا پتہ:۔ نامی بک ڈپو محلہ اندر کوٹ میرٹھ

مثنوی سحر — سنسکرت شاعری میں مثنوی شکنتلا نہایت مشہور و معروف چیز ہے، جناب اقبال ورما صاحب سحر ہنگامی نے اس کا منظوم ترجمہ مثنوی سحر کے نام سے شائع کیا ہے، میں نہیں کہہ سکتا کہ اصل سنسکرت زبان کا لطف ترجمہ میں کس حد تک آسکا ہے، لیکن میں نے انگریزی ترجمہ ضرور اس کا دیکھا ہے اور اسی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ جناب سحر ترجمہ کرنے میں حقیقتاً بہت کامیاب ہوئے ہیں، مثنوی میں مباحثہ انداز بیان کے ساتھ جس قدر رنگینی کی ضرورت ہے وہ نہایت خوبی سے اس میں پیدا کی گئی ہے اور جناب ورما کا یہ ادبی کارنامہ یقیناً قابل ستائش ہے یہ مثنوی ۸ر میں دفتر زمانہ کانپور سے مل سکتی ہے۔

سبدِ گل — جناب سید اولاد حسین صاحب شاعر لکھنوی کا مجموعۂ منظومات اس نام سے شائع ہوا ہے۔ اس مجموعہ میں بارہ نظمیں ہیں اور نہایت شگفتہ عنوانات پر لکھی گئی ہیں، نمودِ صبح، زہرہ، برسات اور نور جہاں نہایت پاکیزہ نظمیں ہیں جن سے جناب شاعر کی ذہانت و قدرت نظر پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ بعض نظموں میں قومی جذبات کا بھی اظہار کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ ایسی

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ہر قسم کا عطر ملتا ہے

منظومات کے لئے مخصوص جذبات حماست کی ضرورت ہے اور اُس کا ہم لوگوں میں نقدان ہے اس لئے اگر ان میں کوئی بات نہ ہو تو شاعر کو معذور سمجھنا چاہیئے۔ یہ مجموعہ ایک روپیہ میں جناب مصنف سے بزریا ملا ظریف رامپور کے پتہ پر مل سکتا ہو۔

غذائے روح ترجمہ بھگوت گیتا کا ہے، جسے پنڈت پربھو دیال صاحب مصر عاشق لکھنوی نے اردو نظم کی صورت میں پیش کیا ہے۔ گیتا ہندو مذہب کی نہایت مشہور و دقیق کتاب ہے، لیکن ترجمہ کو دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ جناب عاشق نے کس طرح آسانی سے اس کے مطالب کو نظم کرکے رکھدیا۔ یہ کتاب ایک روپیہ میں مصنف سے نیمچ (چھاؤنی) کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

بچوّں کی دیکھ بھال یہ مختصر سا رسالہ ہے جس کا موضوع نام سے ظاہر ہے۔ تربیت اطفال کا مسئلہ نہایت اہم مسئلہ ہے اور ملک جوں جوں بیدار ہوتا جائیگا اس کی اہمیت بڑہتی جائے گی اس لئے وہ حضرات جو اس موضوع پر لٹریچر فراہم کررہے ہیں یقیناً قابل ستائش ہیں۔ میں نے اس رسالہ کو جستہ جستہ دیکھا اور بہت مفید پایا۔ ضرورت ہے کہ عورتوں کو اس کتاب کا مطالعہ کرایا جائے، تاکہ وہ پرورش و تربیت اطفال کے صحیح اصول سے واقف ہوسکیں، اس کتاب کی قیمت ۸؍ ہے اور جناب اکبر حیدری سے اکبر منزل دہلی کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

مفید الاطفال فن تجوید کا مختصر سا رسالہ ہے جسے مولوی قاری محمد حسین صاحب مدرس مدرسہ بیت العلوم مالی گاؤں ضلع ناسک نے مرتب کیا ہے۔ اگر کلام مجید کی تعلیم کے وقت بچوں کو یہ رسالہ بھی سمجھا کر پڑھا دیا جائے تو قرأت کی بعض مشکلات آسان ہوسکتی ہیں قیمت ۳؍ مصنف کے پتہ سے مل سکتا ہے۔

پیٹنٹ ادویات ڈاکٹر محمد حسین خاں اقبال نے اس کتاب میں بعض نہایت مشہور پیٹنٹ دواؤں کے اجزا مع وزن وغیرہ درج کردیے ہیں، انگریزی میں ایک ضخیم کتاب پیٹنٹ ادویہ کے متعلق لکھی گئی ہے۔ غالباً اسی سے یہ اقبال صاحب نے اقتباس کرکے یہ کتاب مرتب کی ہے۔ کتاب اس لحاظ سے نہایت اچھی ہے کہ بہت سے مجربات مغرب کا علم اس کے ذریعہ سے ہو جاتا ہے لیکن میں اس کو مشکل سے باور کرسکوں گا کہ صرف اجزا اور ان کا وزن معلوم ہو جانے پر دوا بھی ویسی ہی تیار ہوسکتی ہے جیسی ہمیں بازار سے ملتی ہے۔ قیمت دو روپیہ ہے، اور مؤلف سے ہال بازار امرت سر کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

دوشیزہ حصہ اول سردار موہن سنگھ صاحب دیوآنہ ام۔ اے نے اپنی بعض نظموں کا مجموعہ اس نام سے شایع کیا ہے۔ اس ۴۲ صفحہ کے مختصر مجموعہ میں جو مجلد شایع ہوا ہے جناب دیوآنہ کی ۱۹ نظمیں نظر آتی ہیں، اور اس میں کلام نہیں کہ ان سب میں انھوں نے کوئی نہ کوئی جدت و ندرت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ حضرت دیوآنہ انگریزی زبان کے فاضل ہیں اس لئے قدرتاً ان کی اردو نظموں میں مغربی انداز کا پایا جانا ضروری ہے۔ لیکن اگر وہ بجائے اس تمام صنعت و آورد کے، صرف مشرقی طریق اظہار کو اختیار کرکے آمد و مبالغہ پن کی مثالیں پیش کرتے تو بہتر ہوتا۔ ان نظموں کے بعض بعض اشعار حسن تخئیل کے بہتر نمونے ہیں۔ دیکھیئے اس دوشیزہ کا دوسرا حصہ کب تک سامنے آتا ہے۔ قیمت دو روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ ڈاکٹر بن مالی کرشن اگروال ڈیرہ دون۔

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگائیے ہر قسم کا عطر!

معلومات

تاش کی تاریخ

تاش کا کھیل عموماً یوروپ کی اختراع سمجھا جاتا ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ فرانس کے بادشاہ چارلس ششم کی تفریح کے لئے ایک شخص گرنگور نے اسے ایجاد کیا تھا، لیکن یہ غلط ہے، کیونکہ عہدِ مسیح سے قبل ہندوستان و چین میں اس کا رواج پایا جاتا تھا اور ۲۰۰۰ برس قبل مسیح مصر میں اس کا رواج تھا۔

جب تیرھویں صدی عیسوی میں مغل حملہ آوروں نے جپسی (خانہ بدوش) جماعتوں کو ہندوستان سے نکالا تو اُن کے ساتھ یہ کھیل بھی یوروپ میں آیا۔

یوروپ میں سب پہلے اس کا نام ٹروشی رکھا گیا جس کے ذریعہ سے علاوہ تفریح کے جپسی جماعتوں کے عادت کے موافق پیشین گوئی بھی کیجاتی تھی۔ ان تاشوں کی صورت ہندوستان کے تاشوں سے مختلف تھی، ہندوستان کے تاش (جن کو گنجفہ کہنا چاہیئے) گول ہوتے تھے اور چین کے مستطیل۔ ان میں ۴۱ سے ۸۰ تک تاشے ہوتے تھے۔

اسپین والوں کو اس کھیل کا اس قدر خبط ہو گیا تھا کہ آخر کار ۱۳۸۷ء میں وہاں کے بادشاہ کو اس کی ممانعت کے احکام جاری کرنے پڑے۔ یہ کھیل اسپین سے اٹلی گیا اور یہاں سے جرمنی۔ جرمنی نے جو ہمیشہ تجارتی پہلو سے فائدہ اُٹھاتا ہے، کثرت سے تاش بنانے شروع اور جن ممالک میں اس کا رواج تھا وہاں اتنی برآمد کی کہ آخر کار لوگوں کو جرمنی کی اس خطرناک تجارت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنی پڑی۔

جرمنی سے فرانس نے اس کھیل کو حاصل کیا، اور پھر ان پر امراء دربار اور شاہانِ وقت اور بیگمات کی تصویر بنانے کا رواج ہوا، بعد کو محض تفریح اس کا مقصود نہ رہا بلکہ قمار بازی کا ذریعہ بھی اس کو قرار دیا گیا چنانچہ ہنری ہشتم اس کا بڑا شائق تھا اور اس کی بیٹی مارگرٹ کا بھی یہی حال تھا۔

اہلِ کلیسہ نے اس کی سخت مخالفت کی، لیکن چونکہ یہ مخالفت صرف زبانی تھی (کیونکہ یہ لوگ خود چھپ کر کھیلتے تھے) اس لئے زیادہ اثر نہ ہوا تاہم اس میں کچھ اضمحلال ضرور پیدا ہوا، لیکن بعد کو جب حکومت کلیسہ کا دور ختم ہو کر شاہنشاہی کا دَور آیا تو پھر اسی کو ترقی ہوئی، یہاں تک کہ چارلس ثانی رات دن اس میں مصروف رہکر قمار بازی کیا کرتا تھا۔

اب اس کی ترقی کا یہ عالم ہے کہ ولایت میں گذشتہ سال پچاس لاکھ تاش فروخت ہوئے۔ اور لاکھوں پونڈ کا فائدہ تاش بنانیوالوں کو ہوا۔

بندر اور موسیقی

پیرس میں ایک تھیٹر ہے جس کا نام فارتیہ ہے، اس میں آلات موسیقی پر کام کرنیوالے سب کے سب بجائے انسانوں کے بندر ہیں اور آرکسٹرا یعنی موسیقی کی چوکی انھیں کے سپرد ہے۔ ان باجہ بجانیوالے بندروں کا ایک سردار بھی ہے جو فنِ موسیقی کا زیادہ ماہر ہے اور ایک بینڈ ماسٹر کی طرح اپنے تمام ماتحت بندروں سے باجے بجواتا ہے روزآنہ لوگ اس تھیٹر میں

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگائیے

جاتے ہیں اور بندروں کے اس ذہانت پر حیرت کرتے ہیں۔

دنیا کی سب سے چھوٹی آبادی

آرمینیا میں کوہ ارارآط کی چوٹی پر کسی وقت ایک نہایت مشہور تاریخی شہر آباد تھا جس کا نام انی تھا، اس کی آبادی ازمنۂ قدیمہ میں ایک لاکھ تھی اور اپنی تجارت و صناعت کے لحاظ سے بہت مشہور تھا۔ آٹھویں صدی عیسوی سے لیکر دسویں صدی تک خلفاء بغداد کا قبضہ اس پر رہا تھا۔ ۶۰۰ سال سے یہ بالکل ویران ہوگیا ہے۔

امریکہ کی ایک جماعت شرق ادنیٰ کے سیاحت کے سلسلہ میں جب یہاں پہنچی تو اس کو نہایت تعجب ہوا، کہ یہ مقام اب بھی آباد ہے۔ لیکن اسکی آبادی مشتمل ہے صرف ایک راہب، ایک بلی اور ایک الّو پر۔ بلی اس راہب کی رفیق ہے جسے وہ انقرہ سے لایا تھا، اور بوم کلیسہ کے کھنڈروں میں رہتا ہے۔ اسی مسمار شدہ کلیسہ کے ایک حجرے میں راہب اپنی زندگی خدا جانے کب سے بسر کر رہا ہے۔

یوروپ میں مسلمانوں کی آبادی

سرزمین یوروپ کے ملکوں میں جس قدر مسلمان آباد ہیں، ان کا اندازہ وہاں کے ایک رسالے نے اس طرح کیا ہے:۔

البانیہ =	۸۳۰۰۰	بلغاریہ =	۲۷۲۵۰۰
یونان =	۴۷۵۰۰۰	جبل اسود =	۱۰۵۰۰۰
رومانیہ =	۴۴۰۴۷	روس =	۱۵۲۰۰۰۰۰
باقی حصہ یوروپ =	۴۶۲۳۷۰	مجموعہ =	۱۷۷۸۸۹۵۷

نیویارک میں

ہر تین منٹ میں ایک شخص گرفتار ہوتا ہے۔ ہر تیرہ منٹ میں ایک نکاح ہوتا ہے۔ ہر سات منٹ میں ایک شخص دفن کیا جاتا ہے، ہر ڈیڑھ گھنٹے میں ایک شخص کسی حادثہ سے مرتا ہے، ہر ۴۰ گھنٹہ میں ایک قتل ہوتا ہے۔ اور ہر آٹھ گھنٹہ میں ایک خودکشی ہوتی ہے۔

چین کے قید خانے

غالباً یہ خبر حیرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ چین کے قید خانے دنیا کے بہترین قید خانوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ یہاں بجلی کی روشنی ہوتی ہے، قیدیوں کو زندگی کے تمام اسباب راحت بہم پہنچائے جاتے ہیں، ایک لائبریری ہوتی ہے جہاں قیدی آزادی کے ساتھ کتابیں اخبار ورسائل دیکھ سکتے ہیں۔ ایک وسیع میدان ہوتا ہے جہاں قیدی کھیل کود کے مختلف مشاغل میں حصہ لے سکتے ہیں اور چوبیس گھنٹوں میں تھوڑا سا وقت محنت شاقہ کے لئے بھی دینا پڑتا ہے۔ جس میں وہ پتھر کوٹتے ہیں، آٹا پیستے ہیں یا اور اسی طرح کا کوئی سخت کام انجام دیتے ہیں۔

فرانس کا تعیش

حال ہی میں موسیو دانیال حیدری کی صدارت میں ماہرین بادہ خواری کا ایک عجیب و غریب میچ پیرس میں ہوا بڑے بڑے ماہر شراب پینے والے جمع ہوئے اور ہر ایک کے سامنے آٹھ گلاس مختلف قسم کے شرابوں سے بھر کر رکھ دیئے گئے۔ اس کے بعد ان کو اجازت دی گئی کہ وہ ہر گلاس کی شراب چکھ کر بتائیں کہ اس شراب کا کیا نام ہے۔ کتنی پرانی ہے اور کہاں تیار کی گئی ہے۔

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو سے ہر قسم کا عطر خریدیے

امریکہ کی عورت

امریکہ میں اس وقت عورتیں مختلف مشاغل میں منہمک نظر آتی ہے۔ چنانچہ وہاں کے ایک اخبار نے ظاہر کیا ہے کہ اس وقت اسّی لاکھ سے زیادہ عورتیں اپنے قوت بازو سے معاش حاصل کرتی ہیں۔ ان میں ۱۵،۱۷،۶ عورتیں ٹیلیفون پر کام کرتی ہیں ۸،۲۶۷، گاتی بجاتی ہیں ۷،۲۵۲،۶۳ معلم ہیں، ۵۶۵،۲۶۲،۷ نرس ہیں ۶۶،۷۵۵،۴۴ حساب کتاب کا کام کرتی ہیں ۴۴،۷۶۴،۵ ٹائپ کی خدمت انجام دیتی ہیں اور ۴،۷۲،۱۶۳ کلرک ہیں۔

سیاحت فرانس میں پچاس کرور فرانک کا صرف

سرکاری طریقہ پر جو اعداد و شمار فراہم کئے گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاحت کنندگان امریکہ اور دیگر ممالک نے دوران سیاحت میں فرانس کے اندر پچاس کرور فرانک صرف کئے۔

گداگروں کا اخبار

انگلستان میں اخبارات و رسائل کی اشاعت اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ پبلک کا ہر طبقہ اپنے اغراض و مقاصد کے لئے متعدد اخبار اور رسالے شایع کرتا ہے۔ حال ہی میں فقیروں اور گداگروں نے بھی ایک اخبار نکالا ہے، جس کے مضامین زیادہ تر فقر و افلاس سے متعلق ہوتے ہیں اور خبریں بھی اس میں اکثر اسی قسم کی شایع ہوتی ہیں۔ مثلاً بھیان نووارد امیر فلاں ہوٹل میں مقیم ہے۔ اس کی آمدنی معقول ہے۔ اخلاق اچھے ہیں، سخاوت و کرم کا عادی ہے۔

دین مسیح کی تبلیغ طیارہ کے ذریعہ سے

لندن کا ایک بڑا پادری ہوائی جہاز میں بیٹھکر کرۂ زمین کے گرد طواف کرنے کے لئے نکلا ہے، وہ لندن سے کناڈا اور کناڈا سے نیوزیلینڈ گیا ہے اور وہاں سے اسٹریلیا اور دوسرے شرقی ممالک میں ہوتا ہوا انگلستان پہنچے گا سفر شروع کرتے وقت اس نے ظاہر کیا ہے کہ میں دین مسیح کی تبلیغ کے لئے نکلا ہوں۔

مصنوعی گوشت

یوروپ کے بعض کیمسٹ اس کوشش میں ہیں کہ بنولے اور چند دیگر اشیا سے مصنوعی گوشت تیار کریں، جو بلا تکلف طبیعی گوشت کی جگہ استعمال ہو سکے، اگر اس میں کامیابی ہوگئی اور یہ گوشت ہندوستان میں بھی آگیا تو ہندوؤں کی وہ جماعتیں بھی اس کو بلا تکلف کھاسکیں گی جن کے مذہب میں گوشت مطلقاً حرام ہے۔

ایک غلطی کی تصحیح

دسمبر کے رسالہ میں صفحہ ۹۵ پر جناب وصل بلگرامی کی نظم "حسن خوابیدہ" میں تیسرے شعر کا دوسرا مصرعہ یوں چھپگیا ہے:-

خبر لا اس عالم میں کون و مکاں کی

حالانکہ اسے یوں چھپنا چاہیئے تھا۔

خبر لا اسی طرح کون و مکاں کی

ناظرین درست فرمالیں ایڈیٹر

ہر قسم کا عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگائیے